مؤسس : سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
جنوری ۲۰۰۸

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر : پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن

ماہنامہ
ترجمان القرآن

جلد ۱۳۵، عدد ۱، محرم ۱۴۲۹ھ، جنوری ۲۰۰۸ء

○ اشارات

انتخابی تماشا، شرکت یا بائیکاٹ! — پروفیسر خورشید احمد — ۳

○ شذرات

کشمیر: مظلوموں کی پکار، حکمرانوں کا فرار — " — ۳۳

وفاقی شرعی عدالت کا ایک تاریخی فیصلہ — " — ۳۸

آزادیِ رائے اور تضحیک مذہب — امجد عباسی — ۴۱

○ حکمت مودودیؒ

جب انتخابات کے ذریعے تبدیلی ناممکن بنادی جائے...... — ۴۷

○ فہم قرآن

شکر گزار بنو! — سید احمد عروج قادریؒ — ۵۳

○ تزکیہ و تربیت

کامیاب زندگی: چند عملی پہلو — ایمان بنت جوہری — ۶۳

○ پاکستانیات

نظریۂ ضرورت: قانون اور انصاف کا خون — جسٹس سردار محمد رضا — ۷۱

امریکی دھمکیاں اور ملکی سلامتی — عبدالغفار عزیز — ۷۷

○ آفاق و انفس

ڈی این اے، تخلیق الٰہی کا کرشمہ — انجم اقبال — ۸۳

○ دعوت و تحریک

شیخ فرغلی شہیدؒ: زندگی سے کچھ سبق — عبدالحلیم الکنانی — ۹۵

○ کتاب نما — ۱۰۳

○ مدیر کے نام — ۱۰۷

مدیر
پروفیسر خورشید احمد

نائب مدیر
مسلم سجاد

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور - ۵۴۷۹۰
فون: ۵۴۲۵۳۵۶ - ۰۴۲
فیکس: ۵۴۳۲۱۹۴ - ۰۴۲
ای میل: tarjuman@wol.net.pk

انتظامی امور

۵-اے، ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور - ۵۴۶۰۰
فون: ۷۵۸۷۹۱۶، ۷۰۶۵۷۶۵-۰۴۲
فیکس: ۷۵۸۵۵۹۰ - ۰۴۲
ای میل: tarjumanq@wol.net.pk
tarjuman@tarjumanulquran.org
ویب: www.tarjumanulquran.org

قیمت فی شمارہ: ۳۰ روپے
زر سالانہ: ۳۰۰ روپے
۵ سال کے لیے: ۱۲۰۰ روپے
بیرونی ایڈیشن: ۳۵ روپے

بنگلہ دیش، بھارت ۹۰۰ روپے
ایران، مشرق وسطیٰ، مشرق بعید، یورپ، افریقہ ۱۲۰۰ روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا ۱۵۰۰ روپے

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن
A/c No. 1957-3, UBL, Ichhra Br. LHR

زیر اہتمام: الابلاغ ٹرسٹ

محکمہ تعلیم سے منظور شدہ بحوالہ SO(A-IV)4-45/99

چہرے نہیں، نظام بدلیں

[نظام بدلنے کی] یہ کوشش ہمیں صرف اسی لیے نہیں کرنی چاہیے کہ دنیا کی خیر خواہی ہم سے اس کا مطالبہ کرتی ہے۔ نہیں، ہم خود اپنے بھی سخت بدخواہ ہوں گے اگر اس سعی و جہد میں اپنی جان نہ لڑائیں۔ کیونکہ جب اجتماعی زندگی کا سارا نظام فاسد اصولوں پر چل رہا ہو، جب باطل نظریات و افکار ساری دنیا پر چھائے ہوئے ہوں، جب خیالات کو ڈھالنے اور اخلاق و سیرت کو بنانے کی عالم گیر طاقتوں پر فاسد نظامِ تعلیم، گمراہ کن ادبیات، فتنہ انگیز صحافت اور شیطنت سے لبریز ریڈیو اور سنیما [ٹی وی چینلز اور کیبل] کا تسلط ہو، جب رزق کے تمام وسائل پر ایک ایسے معاشی نظام کا قبضہ ہو جو حرام وحلال کی قیود سے نا آشنا ہے، جب تمدن کی صورت گری کرنے اور اس کو ایک خاص راہ پر لے چلنے کی ساری طاقت ایسے قوانین اور ایسی قانون ساز مشینری کے ہاتھ میں ہو جو اخلاق وتمدن کے سراسر مادہ پرستانہ تصورات پر مبنی ہیں، اور جب قوموں کی امامت اور انتظام دنیا کی پوری زمامِ کار اُن لیڈروں اور حکمرانوں کے ہاتھ میں ہو جو خدا کے خوف سے خالی اور اس کی رضا سے بے نیاز ہیں اور اپنے کسی معاملے میں بھی یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ ان کے خالق کی ہدایت اس معاملے میں کیا ہے، تو ایسے نظام کی ہمہ گیر گرفت میں رہتے ہوئے ہم خود اپنے آپ کو ہی اس کے بُرے اثرات اور بدتر نتائج سے کب بچا سکتے ہیں۔

یہ نظام جس جہنّم کی طرف جا رہا ہے اسی طرف وہ دنیا کے ساتھ ہمیں بھی گھسیٹے لیے جا رہا ہے۔ اگر ہم اس کی مزاحمت نہ کریں اور اس کو بدلنے کی کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور نہ لگائیں تو یہ ہماری اور ہماری آیندہ نسلوں کی دنیا خراب اور عاقبت خراب تر کر کے چھوڑے گا۔ لہٰذا محض دنیا کی اصلاح ہی کے لیے نہیں بلکہ خود اپنے بچاؤ کے لیے بھی یہ فرض ہم پر عائد ہوتا ہے —— اور یہ سب فرضوں سے بڑا فرض ہے کہ ہم جس نظامِ زندگی کو پوری بصیرت کے ساتھ فاسد و مہلک جانتے ہیں اُسے بدلنے کی سعی کریں اور جس نظام کے برحق اور واحد ذریعۂ فلاح ونجات ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اُسے عملاً قائم کرنے کی جدوجہد کریں۔ ('جماعت اسلامی کی دعوت'، سیدابوالاعلیٰ مودودی، ترجمان القرآن، جلد ۳۱، عدد ۵، ذی القعدہ ۱۳۶۷ھ، ستمبر ۱۹۴۸ء، ص ۱۷-۱۸)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

۸ جنوری کا انتخابی تماشا

شرکت یا بائیکاٹ!

پروفیسر خورشید احمد

دورِ جدید کی سیاسی تاریخ اور تجربات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو جمہوریت اور آمریت کا بنیادی فرق سمجھنے میں ذرا بھی مشکل پیش نہیں آتی۔ تاہم اصطلاحات، الفاظ اور اداروں کی ظاہری شکل وصورت قدم قدم پر دھوکے اور الجھاؤ میں جکڑ لیتی ہے۔ اس کے باوصف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آمریت، بار بار جمہوری لبادے میں خود کو قابلِ قبول بنانے کے لیے طرح طرح کے کرتب دکھاتی رہتی ہے۔

اس سلسلے کی ایک اہم مثال تو خود انتخابات کا ادارہ ہے۔ بظاہر انتخاب کا عمل جمہوریت اور آمریت دونوں میں مشترک نظر آتا ہے۔ ہٹلر کے دور کا جرمنی ہو، یا مسولینی کی گرفت میں پھڑپھڑاتا اٹلی، اسٹالن کا روس ہو یا مارشل ٹیٹو کا یوگوسلاویہ، فرانکو کا اسپین ہو یا پنوشے کا چلی، حسنی مبارک کا مصر ہو یا موگابے کا زمبابوے ___ انتخابات تو ان سب ممالک میں ہوتے رہے ہیں اور بڑے بلند بانگ دعووں اور زور وشور کے ساتھ ہوتے رہے ہیں۔ بلکہ ان ممالک میں راے دہی کا اوسط (turn-out) مغرب کے بہت سے جمہوری ممالک بشمول امریکا اور برطانیہ سے کہیں زیادہ رہا ہے مگر اس کے باوجود، ان انتخابات نے ان ممالک کو نہ جمہوری بنایا اور نہ ایسے انتخابات کو کسی نے بھی عوام کی آزادانہ مرضی کے اظہار کا ذریعہ تسلیم کیا۔

جمہوری نظام میں انتخابات کی امتیازی حیثیت یہ ہے کہ:

ا) دستور اور قانون کو بالادستی حاصل ہوتی ہے اور کوئی بھی فرد نہ دستور اور قانون سے بالا ہوتا ہے، اور نہ اسے دستور اور قانون میں دراندازی اور ترمیم و تبدیلی یا تحریف کا کسی درجے میں بھی کوئی اختیار یا موقع حاصل ہوتا ہے۔

ب ملک میں اظہار رائے، تنظیم سازی، اجتماع اور بحث و اختلاف کی آزادی ہوتی ہے، سیاسی جماعتیں برابری کی بنیاد پر سیاسی عمل میں حصہ لیتی ہیں اور عوام کے سامنے اپنا پروگرام اور اپنی کارکردگی کا میزانیہ پیش کرتی ہیں۔ ذرائع ابلاغ آزادی کے ساتھ تمام نقطہ ہاے نظر کا اظہار کرتے ہیں اور قوم کے ضمیر کی حیثیت سے معلومات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ محتسب کا کردار بھی ادا کرتے ہیں۔

ج عدلیہ آزاد اور دستوری اختیارات سے مسلح ہوتی ہے، جو پوری مستعدی اور غیر جانب داری سے دستور کی حفاظت اور نفاذ کے ساتھ بنیادی حقوق کے باب میں ہر شہری اور ہر مظلوم انسان کی دادرسی کی ذمہ داری ادا کرتی ہے، جس کے نتیجے میں کسی کے لیے بھی فرعون بننے کا خطرہ باقی نہیں رہتا۔

د الیکشن کمیشن، انتظامیہ کی گرفت سے آزاد ہوتا ہے اور دستور کے تحت پوری آزادی اور غیر جانب داری کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں ادا کرتا ہے۔ الیکشن کے قواعد وضوابط اور انتظامِ کار بھی شفاف اور ہر شک و شبہے سے بالا ہوتے ہیں اور یہ ادارہ اس کا پورا عمل برسرِ اقتدار جماعت اور حزبِ اختلاف دونوں کی نگاہ میں معتبر ہوتا ہے۔

ہ جہاں اس بات کا خطرہ ہو کہ حکومت انتخابی عمل میں مداخلت کرسکتی ہے، وہاں انتخاب کے دوران غیر جانب دار عبوری حکومت کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے۔

اس پانچ نکاتی نقشۂ کار میں منعقد ہونے والے انتخابات کو ملک اور بیرون ملک اعتماد کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، سب اسے قابلِ بھروسہ اور قانونی و اخلاقی اعتبار سے درست تسلیم کرتے ہیں۔ اگر یہ نقشۂ کار موجود نہ ہو تو پھر انتخابات ایک ڈھونگ اور تماشے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور اس کے نتیجہ میں حکومتوں کے بننے اور بدلنے کے اس عمل میں عوام کا کردار محض ایک تماشائی کا سا بن کر رہ جاتا ہے اور خود بیلٹ بکس کا تقدس ختم اور سیاسی تبدیلی کے لیے اس کا کردار

دم توڑ دیتا ہے۔

بلاشبہہ جمہوری نظام میں صدارتی اور پارلیمانی انتخابات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور پورا سیاسی عمل اسی محور کے گرد گھومتا ہے۔ نیز یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے انتقالِ اقتدار ہوتا ہے، اور عوام کی آزاد مرضی سے قیادت کا چناؤ عمل میں آتا ہے۔ متعین وقفوں پر ایسے ہی آزاد اور شفاف انتخابات جمہوری نظام کی پہچان ہیں۔

جماعت اسلامی پاکستان نے مارچ ۱۹۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی میں 'قرارداد مقاصد' کے منظور کیے جانے کے بعد سے سیاسی تبدیلی کے لیے جمہوری ذرائع اور انتخابی راستے کو اختیار کیا ہے اور وہ اس پر سختی سے قائم ہے لیکن جماعت اسلامی نے پہلے دن سے انتخابی عمل کے دستور اور قانون کے مطابق اور اس پورے عمل کو قواعد وضوابط اور انتظامِ کار کے اعتبار سے غیر جانب دار اور شفاف ہونے کو ضروری قرار دیا ہے۔ پنجاب میں ۱۹۵۱ء سے صوبائی انتخابات سے لے کر آج تک انتخابات کی ضرورت بلکہ ان کے ناگزیر ہونے کے ساتھ ان کے صحیح ماحول میں اور صحیح طریقے سے انعقاد کو بھی لازمی قرار دیا ہے اور انتخابات کے یہ دونوں پہلو باہم مربوط اور ناقابل تفریق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں میں فرق و امتیاز اور انھیں ایک دوسرے سے بھی کاٹ دینے (de-link) کی بھرپور مزاحمت کی ہے۔

آج بھی قوم کو جو امتحان درپیش ہے، اس کا تعلّق نفسِ انتخاب سے نہیں، انتخاب کے پورے نظام اور انتظامِ کار سے ہے، جس کی اصلاح کے بغیر انتخابات بے معنی ہو جاتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وقت کا آمر اور اس کے حواری انتخابی ڈھونگ رچا کر ایک فسطائی نظام کے لیے سندِ جواز (legitimacy) حاصل کر لیتے ہیں، جو دستور کی بالادستی، قانون کی حکمرانی، عدلیہ کی آزادی اور بنیادی حقوق کی حفاظت کے لیے پیغامِ موت کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسا عمل ملک اور قوم کو شخصی آمریت، سیاسی غلامی اور ننگے استبداد کے نظام کی جہنّم میں جھونکنے کے مترادف ہوتا ہے۔ اس نظام کو چیلنج کیے بغیر اور دستوری، قانونی و انتظامی نقشۂ کار کی اصلاح کے بغیر انتخابات میں شرکت کا منطقی نتیجہ نہ صرف جمہوریت اور قانون کی حکمرانی کے اصول کی نفی ہے، بلکہ خود اپنے ہاتھوں سے آمریت کی زنجیروں کو مستحکم کرنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس ناپاک اور خطرناک کھیل کا پردہ چاک کرنے کے لیے مؤثر احتجاج کی ضرورت ہے اور موجودہ حالات میں اس کا بہترین ذریعہ انتخابات میں شرکت نہیں بلکہ ان کا بائیکاٹ ہے ___ واضح رہے کہ بائیکاٹ خود مطلوب نہیں، وہ احتجاج کا ایک ذریعہ ہے، تاکہ اقتدار پر قابض عناصر کے اصل عزائم کو بے نقاب کیا جاسکے اور قابلِ قبول انتخابات کا اہتمام ہوسکے۔

● **بائیکاٹ، پس منظر اور جمہوری روایت:** بائیکاٹ کی ایک نوعیت ووٹ کا منفی استعمال ہے، جس کا مقصد ووٹ کے تقدس کی حفاظت اور بیلٹ بکس کو آمریت کی خدمت کے لیے استعمال کیے جانے سے روکنا ہے۔ انتخابی بائیکاٹ کوئی جذباتی یا منفی عمل نہیں، بلکہ احتجاج اور سیاسی مقاصد کو جمہوری طریقے سے حاصل کرنے کا ایک معروف اور جانا پہچانا طریقہ ہے۔ جو لوگ بائیکاٹ کو ایک جذباتی، منفی اور غیرمؤثر حربے کے طور پر پیش کر رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ اس طرح ووٹ کے ضائع ہونے کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا، ہم ان کو غوروفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ ووٹ کو ضائع کرنے بلکہ اس کے استحصالی استعمال کا راستہ انجینیرڈ الیکشن (دھاندلی زدہ انتخابات) میں شرکت ہے یا بائیکاٹ کے ذریعے نظامِ انتخاب کو جمہوری ضوابط کا پابند بنا کر انتقالِ اقتدار کے لیے صحیح فریم ورک کو وجود میں لانے کے لیے جدوجہد کرنا، مؤثر ذریعہ ہے؟

قانون کی مستند کتاب *Black's Law Dictionary* میں اصطلاح 'بائیکاٹ' کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

> کسی خاص فرد یا کاروبار سے اتفاقِ راے سے معاملہ یا تجارت کرنے سے انکار تاکہ رعایتیں حاصل کی جائیں یا اُن اقدامات یا طرزِعمل سے اظہارِ ناپسندیدگی کیا جائے جو معاملات میں مستعمل ہوں۔ (ص ۱۸۹)

پینگوین کی شائع کردہ *Dictionary of International Relations* میں 'بائیکاٹ' کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے: ''اس سے کسی ریاست یا ریاستوں کا سماجی، اقتصادی، سیاسی اور عسکری تعلقات سے منظم انکار ہے، تاکہ انھیں سزا دی جاسکے یا رویے کو مطلوبہ صورت کی طرف لایا جاسکے''، جب کہ اوکسفرڈ لغت براے علمِ سیاست اسے یوں بیان کرتی ہے: ''ناپسندیدگی

کے اظہار کے لیے وضع کردہ ایک طریقہ، مثلاً کسی اجلاس میں شریک نہ ہونا، یا کسی ملک یا کمپنی کی مصنوعات نہ خریدنا، تاکہ اُسے سزا دی جاسکے یا اُس پر پالیسی، موقف یا رویہ تبدیل کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جاسکے۔ (۱۹۹۶ء، ص ۴۲)

تجارت ہو یا سیاست، بین الاقوامی تعلقات ہوں، یا سماجی روابط و معاملات، بائیکاٹ اظہارِ احتجاج اور مطلوبہ اہداف کے حصول کے لیے پُرامن ذرائع سے سیاسی قوت کے استعمال کا ایک معتبر راستہ ہے۔ نیز شدید نکتہ چینی (strictures)، پابندیاں اور بائیکاٹ سب ہی اس ترکش کے مختلف تیر ہیں۔ اسرائیل اور شمالی افریقہ کی نسل پرست اور غاصب حکومتوں کے خلاف برسوں اسے استعمال کیا گیا ہے اور اس کے قرار واقعی اثرات رونما ہوئے ہیں۔ ایران اور عراق کے خلاف بھی یہ ہتھیار استعمال ہوا ہے اور ہم بھی اس کا نشانہ بنے ہیں۔ خود برعظیم کی سیاسی جدوجہد میں برطانوی اقتدار کے خلاف بائیکاٹ کے ہتھیار کو بار بار استعمال کیا گیا ہے اور مکمل بائیکاٹ یا جزوی بائیکاٹ کی بحثوں میں پڑے بغیر دونوں ہی شکلوں میں اس کا استعمال کیا گیا ہے، جس نے بالآخر سامراجی اقتدار کی چولیں ہلا دیں۔ اس عمل کا آغاز ۱۹۲۰ء میں ناگ پور کانگریس سے ہوا، اور اس حکمت عملی کے چار ستون تھے:

- قانون ساز اداروں کا بائیکاٹ ● عدالتوں کا بائیکاٹ ● تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ
- مناصب اور اعزازات واپس کرنے کا اعلان۔

وکلا اور سیاسی جماعتیں، آج کے حالات میں ان سیاسی ہتھیاروں کو استعمال کر رہی ہیں، عدالتوں کے میدان میں بھی اور اب انتخابات کے میدان میں بھی۔ انھیں کسی اعتبار سے بھی جذباتی یا منفی اقدام قرار نہیں دیا جاسکتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہ اور دوسرے پُرامن سیاسی ہتھیار جب بھی ٹھیک طرح اور استقلال کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں، ان کے اثرات لازماً نکلے ہیں۔

البتہ جو بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہیے، وہ یہ ہے کہ بائیکاٹ فی نفسہٖ نہ کوئی سیاسی مقصد اور ہدف ہے اور نہ اسے مستقل حکمت عملی ہی کہا جاسکتا ہے۔ یہ تو موجودہ آمرانہ نظام اور ایک غاصب گروہ کے ہاتھوں قوم کو بے دست و پا کرنے جیسے اقدامات کو قانونی تحفظ دلانے کے مذموم منصوبوں کے خلاف احتجاج کا ایک ذریعہ اور سیاسی دباؤ کا وہ حربہ ہے، جس سے اس

نظام کی خباثت اور اس کے ناقابلِ قبول ہونے کو ظاہر و باہر کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح ملک کو لاقانونیت، فردِواحد کی حکمرانی اور من مانی سے نجات دلانے اور اس کے ایجنڈے کی تکمیل کے لیے آلۂ کار بننے کے بجاے، اس ایجنڈے کو تبدیل کر کے ایک حقیقی جمہوری اور دستوری نظام کی طرف ملک کو لانے کی کوشش ہے، تاکہ بالآخر صحیح معنوں میں آزاد، غیرجانب دار، منصفانہ اور شفاف انتخابات منعقد ہوسکیں اور ملک اور قوم جمہوریت کی طرف صحیح معنی میں پیش قدمی کرسکیں۔

● **موجودہ حالات کی نزاکت**: مسئلے کی اصل نوعیت کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ آج کے انتخابات عام حالات میں منعقد نہیں ہورہے۔ پرویزی آمریت کے آٹھ سال، ان کا اصل پس منظر ہیں اور اس سے بھی زیادہ اہم وہ پیش منظر ہے جس کا تانا بانا ۹ مارچ ۲۰۰۷ء سے بُنا جارہا ہے، اور جسے آخری شکل ۳ نومبر کی ایمرجنسی (دراصل جنرل مشرف کے مارشل لا نمبر۲)، عبوری دستور اور ۱۵ دسمبر کو ایمرجنسی اور پرویزی دستور کو مستقل شکل دے کر انتخابات کا جال پھیلایا گیا ہے۔ جس کے بعد اپنی من پسند عدلیہ اور اپنی تابع مہمل عبوری حکومت اور الیکشن کمیشن کے ذریعے قوم کے حق حکمرانی کو اغوا کرنے کا انتظام کیا جارہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا آنکھوں دیکھے اس جال میں قدم رکھا جائے، یا اس جال کو تار تار کرنے کے لیے بائیکاٹ کا راستہ اختیار کیا جائے، اور دستوری وعوامی نظام کو بحال کرا کر ایک غیرجانب دار حکومت اور ایک آزاد اور معتمدعلیہ الیکشن کمیشن کے تحت انتخابات کے انعقاد کو یقینی بنایا جائے۔ انتخاب تبدیلی کا راستہ ہیں اور ان سے فرار کا تصور بھی کوئی جمہوری قوت نہیں کرسکتی، لیکن انتخابات کو صحیح معنوں میں انتخابات ہونا چاہیے، ورنہ وہ ایک ایسا جال بن جاتے ہیں جس میں گرفتار ہوکر انسان آمریت کے تسلسل کے لیے آلۂ کار بن کر رہ جاتا ہے۔

ایک طرف ملک کے پورے نظامِ حکومت، دستوری انتظام، بنیادی قانون اور اداروں کو پامال کیا جارہا ہے تو دوسری طرف ستم یہ ہے کہ جمہوریت کے بڑے بڑے علَم بردار اور جمہوریت کی دعوے دار سیاسی جماعتیں صرف 'میدان دوسروں کے لیے نہ چھوڑنے' کا سہارا لے کر ایسے انتخابات میں شرکت کر رہی ہیں۔ یہ سب اسی 'نظریۂ ضرورت' کا ایک نیا اڈیشن ہے جس کی تباہ کاریاں ملک اور قوم ۱۹۵۴ء سے دیکھ رہے ہیں۔ سیاسی دروبست کا حلیہ بگاڑنے کے اس عمل کا آغاز ۱۹۵۴ء میں پہلی دستورساز اسمبلی کی تحلیل اور پھر پہلے قومی انتخابات سے چند ماہ قبل اکتوبر

۱۹۵۸ء میں مارشل لا کے نفاذ سے شروع ہوا۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ ملک کی اعلیٰ عدالتوں نے نظریۂ ضرورت کے نام پر دستور کے توڑنے اور لاقانونیت کو قابل قبول قرار دے کر انھیں قانونی سند جواز دینے کے جرم کا ارتکاب کیا، اور سیاسی جماعتوں نے کمزوری دکھا کر مزاحمت کے بجاے مصالحت کا راستہ اختیار کیا۔ یہی وہ پہلی ٹیڑھی اینٹ تھی جس نے پورے قومی و قانونی ڈھانچے کو اس کی بنیادوں سے ہلا کر رکھ دیا اور پھر سیاسی نظام کی دیوار ٹیڑھی ہی اٹھتی چلی گئی۔

اسی نظریۂ ضرورت کی نئی شکل کو، پرویزی آمریت کے ایک ناقابلِ اعتبار الیکشن کمیشن اور ایک ناقابلِ قبول عبوری حکومت کے ذریعے انتخابات میں شرکت کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک قوم اس 'نظریۂ ضرورت' سے نجات نہیں پاتی، نہ وہ اپنی آزادی کی حفاظت کرسکتی ہے اور نہ جمہوریت کی روشن صبح یہاں کبھی طلوع ہوسکے گی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ الیکشن کے اکھاڑے میں اترنے والے بڑے بڑے پہلوان ان انتخابات میں بڑے پیمانے پر دھاندلی ہونے کا واویلا بھی کر رہے ہیں اور اس نظام کو چیلنج کرنے کے بجاے اس میں شریک بھی ہورہے ہیں۔ آج ہم سب امتحان کی کسوٹی پر پرکھے جارہے ہیں۔ وقتی، ذاتی اور جماعتی مصلحتیں ایک طرف ہیں۔ دوسری طرف اصول، دستور اور نظام کی اصلاح اور خرابی کے اس عمل کو ہمیشہ کے لیے روک دینے کی خواہش اور کوشش ہے۔

پرویزی آمریت کے آٹھ سال اور مستقبل کا ایجنڈا

جنوری ۲۰۰۸ء کے انتخابات دراصل پرویزی آمریت کے آٹھ سالہ دور کو ایک نئی شکل میں، آیندہ پانچ سالوں کے لیے وسعت دینے کا ایک منصوبہ ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس نظام کے خدوخال کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے، تاکہ قوم اور تمام سوچنے سمجھنے والے اچھی طرح جان لیں کہ اس وقت ملک و قوم کے سامنے اصل ایشو کیا ہیں؟

۱- **شخصی حکومت کو دوام**: اس نظام کا سب سے نمایاں پہلو عملاً ایک فرد کی شخصی حکومت کو دوام بخشنا ہے، خواہ اس پر کیسا ہی لبادہ کیوں نہ اوڑھایا جائے اور وردی زیب تن ہو یا شیروانی!

پرویز مشرف کے پورے دور حکومت کا مرکزی نکتہ صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ قومی مفاد وہ ہے جسے پرویز مشرف 'قومی مفاد' کہیں۔ انھوں نے بار بار کہا ہے کہ نہ دستور اہم ہے اور نہ جمہوریت۔ جسے وہ 'پاکستان' اور 'سب سے پہلے پاکستان' کہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ 'سب سے پہلے میں ___ یعنی صرف پرویز مشرف!'

جمہوریت میں 'قومی مفاد' کا سب سے بڑا ترجمان قومی دستور ہوتا ہے جس پر پوری قوم کا اجماع (consensus) ہوتا ہے اور جسے بنیادی قانون کہا جاتا ہے۔ اس دستور کے فریم ورک میں قومی مفاد وہ ہے، جس کا اظہار خود قوم اپنے منتخب نمایندوں کے ذریعے کرے اور اس قومی مفاد کی کچھ لہریں عوامی جلسوں، سیاسی جماعتوں کے اظہارِ خیال، میڈیا کے ذریعے عوام کی ترجمانی اور پبلک کی راے عامہ کے دوسرے معتبر مظاہر ہیں۔ لیکن پرویز مشرف کا فلسفہ یہ ہے کہ قومی مفاد کا تعین کرنا صرف ان کا استحقاق (prerogative) ہے۔ ان کی راے اور ان کی ذات ہی دستور، قانون، ملک، جمہوریت، عدلیہ ہر چیز پر حاوی ہے۔ یہ وہی مطعون و مذموم فلسفہ ہے جس کا دعویٰ فرانس کے بادشاہ لوئی ہفتم نے کیا تھا: ''میں قانون ہوں''۔ ہٹلر، مسولینی، اسٹالین، شاہ ایران، حسنی مبارک، صدام حسین سب کی ذہنیت یہی تھی۔ اور آج پرویز مشرف انھی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں جس کا ثبوت وہ کچھ ہے جو پرویز مشرف نے پہلے ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء میں کیا اور پھر ۳ نومبر ۲۰۰۷ء کو جو اقدام کیا اور جس کا تازہ ترین اظہار ۱۵ دسمبر کے روز فردِ واحد کے ہاتھوں دستور کا حلیہ بگاڑنے کے سارے عمل کو نہ صرف دستور کا حصہ قرار دے کر کیا گیا بلکہ اپنے ہی قلم سے اپنے ان تمام اقدامات کو نام نہاد 'قانونی تحفظ و جواز' بھی دے دیا جنھیں بین الاقوامی میڈیا کے سامنے 'غیر قانونی (illegal) اور ماوراے دستور (extra-constitutional) ہونے کا خود ہی اعتراف کیا تھا۔

● **عوامی ردعمل:** پاکستان میں عوامی راے کے جتنے بھی جائزے لیے گئے ہیں، وہ سب یہ ظاہر کرتے ہیں کہ پرویز مشرف کی کسی بات پر قوم کو اعتبار نہیں اور آج وہ سب سے زیادہ ناپسندیدہ سیاسی حکمران ہیں۔ وہ 'درمدح خود' خواہ کچھ بھی کہیں لیکن دنیا بھر میں آج کوئی ان کے ایسے شیخی پر مبنی دعووں کو کوئی وزن نہیں دیتا اس لیے کہ یہ سارا کھیل ان کی اپنی ذات کے گرد گھومتا

ہے۔ پاکستان، جمہوریت یا قومی مفاد سے اس کا دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔

گیلپ پاکستان نے ۵ اور ۶ نومبر ۲۰۰۷ء (ایمرجنسی کے لبادے میں مارشل لا) کے دو اور تین دن بعد جو سروے کیا، وہ قوم کے جذبات کا حقیقی ترجمان ہے:

- ایمرجنسی کی مخالفت ۶۷ فی صد...... تائید ۱۹ فی صد۔
- کیا ایمرجنسی پاکستان کے مفاد میں ہے؟ ۶۸ فی صد نہیں...... ۱۸ فی صد ہاں
- کیا چیف جسٹس کی برطرفی صحیح تھی؟ ۷۰ فی صد نہیں...... ۱۴ فی صد ہاں۔
- ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایمرجنسی کا نفاذ پاکستان کے مفاد میں تھا جب کہ دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ مشرف کے اپنے مفاد میں تھا—— آپ کیا کہتے ہیں؟ پاکستان کے مفاد میں ۱۸ فی صد...... مشرف کے مفاد میں ۶۸ فی صد۔

انٹرنیشنل ری پبلکن انسٹی ٹیوٹ کے زیراہتمام کیے جانے والے رائے عامہ کے جائزے کے مطابق، جو ۱۹ سے ۲۸ نومبر ۲۰۰۷ء کے درمیان ہوا، یہ بتایا گیا ہے کہ بحیثیت مجموعی، ۶۶ فی صد سے لے کر ۷۵ فی صد تک آبادی مشرف، ان کی پالیسیوں اور اقدامات کے مخالف ہے، جب کہ ان کی تائید آبادی کے صرف ایک چوتھائی تک سکڑ گئی ہے۔ ایمرجنسی کے نفاذ کے لیے مشرف کے موقف کو آبادی کے ۶۶ فی صد نے رد کیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ یہ سارا اقدام عدلیہ کو اس خدشہ سے میدان سے ہٹانے کے لیے کیا گیا تھا کہ وہ پرویز مشرف کو صدارت کے لیے نااہل قرار دے دے گی۔ ہوا کے رخ کا اندازہ عوام کی اس رائے سے کیا جاسکتا ہے جس میں انھوں نے 'ہاں' میں جواب دیا ہے:

- دستور کی معطلی غلط تھی　　۷۱ فی صد
- سپریم کورٹ کے ججوں کی حراست غلط تھی　　۷۷ فی صد
- ٹی وی نیوز چینلوں پر پابندی غلط تھی　　۷۶ فی صد
- سپریم کورٹ کے ججوں کا نیا حلف غلط تھا　　۷۳ فی صد
- سیاسی جلسوں اور جلوس پر پابندی غلط تھی　　۷۰ فی صد
- وکلا، سول سوسائٹی، سیاسی قائدین کی نظربندی غلط تھی　۷۶ فی صد

● **بین الاقوامی ردعمل**: صاف ظاہر ہے کہ ملک کی عظیم اکثریت، پرویز مشرف کے اقدامات کو غلط اور قومی مفاد کے خلاف سمجھتی ہے۔ ان کا اپنا دعویٰ یہ ہے کہ انھوں نے فیاضی کا ثبوت دیتے ہوئے ملک کو جمہوریت کا 'تحفہ' دیا ہے اور پریس اور الیکٹرانک میڈیا کو آزادی سے نوازا ہے۔ لیکن ان کے دعووں کو نہ ملک کی عظیم اکثریت تسلیم کرتی ہے اور نہ ان کے بیرونی سرپرست، جن کی بیساکھیوں پر انھوں نے اپنی بساط بچھائی ہے۔ واشنگٹن پوسٹ لکھتا ہے: ''گذشتہ دو ہفتوں میں جنرل پرویز مشرف نے جو بھی اقدام اٹھایا ہے اُس کا ایک ہی مقصد ہے کہ اقتدار پر اپنے کنٹرول کو استحکام بخشا جائے''۔ (دی نیشن، ۳دسمبر ۲۰۰۷ء)

واشنگٹن پوسٹ ہی نے اپنے ۹ادسمبر کے اداریے میں ان کے اس دور کے کارناموں کا یوں احاطہ کیا ہے:

> ''اگرچہ اُنھوں نے باضابطہ طور پر اُس حالت کو ختم کر دیا ہے جو اُنھوں نے ۶ ہفتے قبل نافذ کی تھی، مگر اس کے باوجود پرویز مشرف پر تنقید کرنے کا مطلب جیل جانا ہے۔ عدالتی نظام وکلا کے بائیکاٹ کی وجہ سے مفلوج ہو چکا ہے کیونکہ مشرف نے سپریم کورٹ کے اُن ججوں کو بحال کرنے سے انکار کر دیا ہے جن کو اُنھوں نے غیر قانونی طور پر برطرف کر دیا تھا۔ ملک کی بڑی سیاسی جماعتوں کے سربراہ بارہا انتباہ کر چکے ہیں کہ صدر کا منصوبہ ہے کہ اگلے ماہ پارلیمانی انتخابات میں جعل سازی کی جائے تاکہ اُن کی اپنی پارٹی، جو بے انتہا غیر مقبول ہو چکی ہے، برسرِ اقتدار رہے۔
>
> حقیقت میں اُن کی واحد کامیابی یہ ہے کہ اُنھوں نے سپریم کورٹ کے ہاتھوں اپنی برخاستگی سے اپنے آپ کو بچایا ہے۔ اس کی قیمت یہ ادا کی گئی ہے کہ ملک کو مزید غیر مستحکم کر دیا گیا ہے''۔

کلدیپ نیر، مشرف صاحب کے مداح رہے ہیں، وہ اپنے مضمون میں واشنگٹن پوسٹ کو دیے گئے انٹرویو کی روشنی میں موصوف کی خود پسندی اور خود آرائی پر یوں اظہار کرتے ہیں:

> بدقسمتی سے مارشل لا انتظامیہ کی طرف سے دستور میں بار بار ترامیم کی گئی ہیں، لیکن جس انداز سے مشرف نے اِسے مسخ کیا ہے وہ سب پر بازی لے گئے ہیں۔ اُنھوں نے

ایسے وقت میں عدلیہ کو برباد کردیا کہ جب اس کی آزادی کی طرف جمہوری ممالک بشمول بھارت میں رشک کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا۔ عدلیہ کے علاوہ مشرف نے میڈیا کو بھی نقصان پہنچایا ہے۔ اس کے باوجود بھی مشرف نڈر بنے ہوئے ہیں۔ واشنگٹن پوسٹ کو دیے گئے ایک انٹرویو سے اُن کے مستقبل کے عزائم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جب اُن سے سوال کیا گیا کہ وہ وردی اُتار دینے کے بعد فرق محسوس کریں گے تو مشرف نے جواب دیا: ''فوج کا انتظام چیف آف اسٹاف کے حوالے ہے جو اپنے کام سے انہماک رکھتا ہے اور میں پاکستان کا صدر بن جاؤں گا۔ اگر دونوں ہم آہنگ رہیں تو صورت حال بہتر رہے گی''۔ پھر ایک اور سوال کے جواب میں اُنھوں نے کہا کہ ''میں چیف آف اسٹاف کو مقرر کروں گا''۔ اس میں وزیراعظم کا کوئی ذکر نہیں جو عوام کا منتخب نمایندہ ہے۔ ایمرجنسی کا نفاذ اس لیے کیا گیا ہے تاکہ سپریم کورٹ سے اپنے آپ کو بچایا جاسکے۔ (ہندستان ایکسپریس، ۱۳ نومبر ۲۰۰۷ء)

لندن کا ہفت روزہ دی اکانومسٹ لکھتا ہے:

پاکستان میں نہ جمہوریت ہے اور نہ استحکام۔ جنرل پرویز مشرف کی یہ اُلٹی منطق ہے کہ: آرمی ڈکٹیٹر نے پاکستان کو جمہوریت عطا کی ہے اور مارشل لا کا سایہ بھی موجود ہے تاکہ دستور کی حفاظت کی جائے۔ عدلیہ پر اُنھوں نے جو تازہ ترین حملہ کیا ہے، وہ اُن کے اقتدار سنبھالنے کے بعد سپریم کورٹ کے انتہائی مؤثر ۱۷ میں سے ۱۲ ججوں کو یک قلم برخاست کرنا ہے۔ ان میں چیف جسٹس افتخار محمد چودھری گرفتار ہیں۔ ان کی جگہ فوج کے منتخب کردہ خوشامدی لگا دیے گئے ہیں۔ اسی وجہ سے جنرل مشرف نے اقتدار پر قبضہ جمایا۔

یہ ہے شخصی حکمرانی کا وہ آہنگ، جو پرویز مشرف کے آٹھ سالہ دورِ حکومت کا حاصل ہے۔ دستورِ مملکت جس کی پابندی کا حلف اس نے اٹھایا ہے، اس کو بار بار تار تار کرنے کا یہ انداز! مشرف صاحب جب چاہیں تلوار کی نوک سے دستور کے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالیں۔ جس ادارے کو چاہیں تباہ و برباد کرڈالیں، جس کی آزادی چاہیں سلب کرلیں، بیرونی حکومتوں سے جو چاہیں عہد و پیماں

کرلیں، اپنی ملازمت میں جب چاہیں اور جن مراعات کے ساتھ چاہیں توسیع کرلیں، عدالتِ عالیہ کے جس جج کو چاہیں گردن دبوچ کر باہر نکال دیں، میڈیا پر جب چاہیں من پسند قدغنیں عائد کردیں اور دستور کا حلیہ بگاڑ کر اپنے اقدامات کو خود ہی تحفظ بھی دے ڈالیں ___ یہ ہے اس شخص کا طرزِ حکمرانی۔ کیا اس طرزِ حکمرانی میں جمہوریت، قانون کی بالادستی اور اداروں کے استحکام اور انتخابات کے ذریعے سیاسی قیادت کی تبدیلی کا کوئی تصور کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بالغ نظر سیاسی رہنما ہوں یا بار اور بنچ (Bar & Bench) کے سوچنے سمجھنے والے عناصر ___ سب یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ پرویز مشرف کسی بھی صورت میں منظور نہیں، خواہ وردی میں ہو یا وردی کے بغیر۔ اور عدالتِ عالیہ کو اسی فیصلہ سے روکنے اور اپنی ذات کو ملک پر مسلط کرنے کے لیے ایمرجنسی اور عبوری دستور جو دراصل پرویزی دستوری آرڈر (PCO) تھا، اس کا راستہ اختیار کیا گیا۔ اسی پی سی او کو اب پوری عیاری سے دستور کا حصّہ بنا دیا گیا ہے اور انتخابات کا ڈراما اسی کے تحت اسٹیج کیا جا رہا ہے۔

۲- ملکی آزادی اور خودمختاری پر زد: پرویزی تلوار کی دوسری زد ملک کی آزادی، حاکمیت اور خودمختاری پر پڑی ہے۔ دوسرے ممالک، خصوصیّت سے امریکا اور اس کے زیراثر ممالک، جس درجے میں اور جس نوعیت کی مداخلت کا نشانہ آج پاکستان کو بنا رہے ہیں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ قائداعظم نے تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن تک کو عارضی طور پر گورنر جنرل ماننے سے انکار کردیا تھا۔ جب اس وقت کی پاکستانی فوج کے برطانوی کمانڈر نے سربراہِ مملکت کے احکام ماننے میں تردّد کا راستہ اختیار کیا تو ان سے بھی خلاصی حاصل کرلی گئی، لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ امریکا کے سفارت کار وائسرائے کا سا مقام حاصل کرچکے ہیں۔ ان کے تیسرے درجے کا افسر بھی صدرِ مملکت، فوج کے سربراہ، آئی ایس آئی کے چیف اور جس سطح کے حکام سے چاہیں ملاقات کرتے ہیں اور احکام جاری کرتے ہیں۔ صدر بش سے لے جارج گیٹس تک کھلے الفاظ میں کہہ رہے ہیں کہ: ہم جب ضرورت سمجھیں گے پاکستان کی سرزمین پر اپنے اہداف کے حصول کے لیے بلاواسطہ فوجی کارروائی کریں گے ___ اور وہ صرف یہ دعویٰ ہی نہیں کر رہے، بلکہ عملاً متعدد بار افغانستان سے امریکی اور ناٹو افواج پاکستان کی حدود میں کارروائیاں کرچکی ہیں اور پرویز مشرف

کی حکومت کو احتجاج کی توفیق بھی نہیں ہوئی بلکہ چند مواقع پر تو غیرت وحمیت کو دفن کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا گیا: ''وہ کارروائی امریکا نے نہیں خود ہم نے کی تھی''۔

بات صرف دہشت گردی کے خلاف امریکا کی نام نہاد جنگ اور اس میں پاکستان کے کردار تک محدود نہیں، معاشی پالیسیوں سے لے کر تعلیمی پالیسی تک اور اس سے بھی بڑھ کر اب پاکستان کے لیے مستقبل کی قیادت کا اصل انتخاب اور ان کی 'رسم تاج پوشی' تک واشنگٹن کے دستِ شفقت کے ذریعہ ہو رہی ہے۔ پرویز مشرف کو کن کن کے ساتھ اشتراکِ اقتدار کرنا چاہیے اور امریکا کے چہیتوں کو ملک میں لانے اور اقتدار کے منصب تک پہنچانے کے لیے ان کے کن کن جرائم کو معاف کرنا اور قومی مصالحت کے نام پر کرپشن کے کن کن داغوں کو دھونے اور ملک اور ملک سے باہر مقدمات کو واپس لینا ہے؟ یہ بھی امریکا اور اس کے گماشتوں کے اشاروں پر طے ہو رہا ہے۔ امریکا ہی نہیں اب تو یورپ اور شرق اوسط کے سفرا بھی ملکی سیاست کے دروبست کو اپنے ڈھب میں ڈھالنے میں مصروف ہیں۔ امریکا نے ۲۰۰۷ء میں ایک نہیں بلکہ دو ایسے قوانین دونوں ایوانوں سے پاس کرالیے ہیں، جن کے تحت پاکستان کو دی جانے والی امداد کو صرف دہشت گردی کے خلاف جنگ ہی نہیں، بلکہ ملک کی اندرونی سیاست، تعلیم اور سب سے بڑھ کر ملک میں سیکولرزم اور امریکا کی دل پسند 'روشن خیالی' کے فروغ سے مشروط کر دیا گیا ہے۔ پرویز مشرف اور ان کے حواریوں کی غیرت نے اس ظلم یا بہ الفاظ صحیح تر غلامی کو بھی گوارا کرلیا ہے اور اس لیے کرلیا ہے کہ تاکہ ہر سال چند سو ملین ڈالر حاصل ہوتے رہیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ بڑے ہی اہم امور پر اب ہماری خارجہ سیاست کی صورت گری امریکا اور بیرونی قرضے اور امداد دینے والے ادارے کر رہے ہیں۔ بھارت سے دوستی، کشمیر کے مسئلے پر یوٹرن اور کشمیر کی تحریک مزاحمت سے بے وفائی، اسرائیل سے پینگیں بڑھانے کا خطرناک اور شرمناک کھیل بھی اسی قوم فروشی کے مظاہر اور اس میں پرویز مشرف اور خورشید محمود قصوری کے ساتھ بے نظیر بھٹو بھی اپنے اپنے انداز میں اور 'حسب توفیق' امریکا اور اسرائیل کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے شریک ہیں۔

یہ صرف پرویز مشرف کے دور میں ہوا ہے کہ پاکستان کے وزیر خارجہ نے اسرائیل کے وزیر خارجہ سے ملاقات کی ہے۔ پرویز مشرف نے امریکن جیوش کانگرس سے نہ صرف خطاب کیا

ہے، بلکہ اسرائیل سے سلسلۂ کلام شروع کرنے اور اسرائیل اور فلسطینی قیادت کے درمیان کردار ادا کرنے کی باتیں کی ہیں۔ پاکستان نے ۶۰ سال میں پہلی بار اقوام متحدہ میں اسرائیل کے پیش کردہ ریزولیوشن کے حق میں ووٹ دیا ہے، جب کہ ان عرب ممالک نے بھی، جو ضمیر کا سودا کر کے اسرائیل کو تسلیم کر چکے ہیں، اس راے شماری کے دوران غیر حاضر رہنے کو ترجیح دی ہے۔ پاکستانی اخبارات میں یہ خبر شائع ہونے نہیں دی گئی کہ نومبر ۲۰۰۷ء میں جان نیگروپونٹے کے دورۂ پاکستان اور پرویز مشرف سے ملاقات سے چند دن پہلے امریکی جیوش کانگرس کی ورلڈ جیوری کے چیئر مین جیک روزن نے خاموشی اور رازداری سے پاکستان کا سفر کیا اور وہ پرویز مشرف صاحب کے علاوہ اس وقت کے ڈپٹی چیف آف اسٹاف جنرل کیانی اور کئی مرکزی وزرا اور اعلیٰ سرکاری حکام سے ملا۔ اس نے امریکا جا کر امریکی لابی کو پرویز مشرف کے حق میں متحرک کرنے کی کوشش کی۔ اس کی تفصیلی رپورٹ یہودی روزنامے *Foreward* میں شائع ہوئی ہے، جو ۲۱ نومبر ۲۰۰۷ء کے شمارے میں دیکھی جاسکتی ہے۔(www.foreward.com/articles/12080)

بے نظیر صاحبہ بھی اسرائیلی صدر شیمون پیریس سے اور اقوام متحدہ میں اسرائیل کے سفیر سے بنفس نفیس ملی ہیں اور اقتدار میں آکر اسرائیل کو تسلیم کرنے کے اشارے بھی دے رہی ہے اور محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو 'ایٹمی توانائی کی بین الاقوامی ایجنسی' (IAEA) کے حوالے کرنے کے عزائم کا بھی اظہار کر رہی ہیں۔

پرویز مشرف اور ان کے حالیہ اور مستقبل کے شریک اقتدار کس کے ایجنڈے پر کام کر رہے ہیں اور امریکا کی خوش نودی کے لیے ملک کی آزادی، حاکمیت اور خودمختاری پر سمجھوتوں کو کہاں تک لے گئے ہیں، اس کا پورا اندازہ شاید ان کے اقتدار سے رخصت ہو جانے کے بعد ہی ہو سکے!

۳- نظریاتی اور دینی تشخص کا مجروح ہونا: پرویزی دور کا تیسرا تحفہ ملک کے نظریاتی، دینی اور اخلاقی تشخص کا بری طرح مجروح ہونا ہے۔ مغربی تہذیب و تمدن سے شیفتگی، تعلیم میں سیکولرازم کا فروغ اور پوری اجتماعی زندگی میں عریانی اور فحاشی کی کھلی چھوٹ کی جو کیفیت آج ہے، پہلے کبھی نہ تھی۔ زندگی کے ہر شعبے کی سیکولر بنیادوں پر تشکیل کی جارہی ہے۔ رواداری اور معروضیت کے نام پر دینی تعلیمات، تہذیبی اقدار، اُمت کے جداگانہ تشخص، اپنے اخلاقی نظام اور

رسم و رواج سب کو پامال کیا جا رہا ہے۔ جس قوم کی نئی نسلیں اپنے دین، اپنی تہذیب اور اپنی تاریخ سے واقف نہیں ہوں گی اور ان پر فخر نہیں کریں گی، وہ اپنی آزادی کو کیسے برقرار رکھ سکیں گی اور دنیا پر اپنا نقش کیسے قائم کر سکیں گی۔

بات صرف اس تہذیبی انتشار تک محدود نہیں۔ قوم جو پہلے ہی فرقوں میں بٹی ہوئی تھی، اس میں فرقہ واریت بلکہ فرقہ وارانہ تصادم کو فروغ دینے کا کھیل بھی کھیلا جا رہا ہے۔ اس میں بیرونی ممالک اور ان کے گماشتے (افراد اور این جی اوز) اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہ تو قوم کی دینی بصیرت اور دینی جماعتوں اور خصوصیت سے متحدہ مجلس عمل کا کارنامہ ہے کہ فرقہ واریت کی آگ نہ پھیل سکی، ورنہ امریکی پالیسی سازوں اور ملکی ایجنسیوں نے اس آگ کو بھڑکانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

پرویز مشرف نے قوم کو انتہا پسندوں اور روشن خیالوں میں تقسیم کر کے اور ان کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کرنے کی بھی بہت کوشش کی ہے، اور اس طرح ملک میں نظریاتی کش مکش کو فروغ دینے کی امریکی حکمت عملی کو آگے بڑھانے میں بڑا خطرناک کردار ادا کیا ہے۔ اختلاف راے خواہ سیاسی ہو یا مذہبی اور نظریاتی، ہر معاشرے کا حصہ ہے اور افہام و تفہیم اور بحث و مذاکرے کے ذریعے ہی فکر انسانی کی ترویج ہوتی ہے۔ مہذب معاشرے کی بنیاد فکر و نظر کے تنوع پر ہے اور اسی سے زندگی میں حُسن اور ترقی کے راستے پھوٹتے ہیں ؎

گل ہاے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق، اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

ہاں یہ ضروری ہے کہ اپنے نظریات کو دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش نہ ہو، تشدد اور قوت کا استعمال نہ کیا جائے (لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْن)۔ لیکن حدود کے اندر اختلاف اور تنوع کو انتہا پسندی اور روشن خیالی کا نام دے کر، لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کرنا تباہی کا راستہ ہے۔ کسی کی نگاہ میں کیا انتہا پسندی ہے اور کیا روشن خیالی ــــــ یہ حکمران طے نہیں کریں گے، قوم کا ضمیر ہی اس کا فیصلہ کرے گا۔ رواداری ضروری ہے مگر امریکا کے ایجنڈے کے مطابق مسلمان معاشرے اور قوم کو انتہا پسندی اور روشن خیالی کے نام پر تقسیم کرنا اور تصادم کی فضا بنانا، اپنی قوم کے ساتھ ظلم ہے

اور یہ بھی پرویزی دور کا ایک تباہ کن تحفہ ہے اور خود انتہاپسندی اور جبر کی قوت سے اپنی بات دوسروں پر مسلط کرنے کی بدترین مثال ہے۔

۴- اداروں کو کمزور کرنے کی کوشش: چوتھا کارنامہ اس دور کا یہ ہے کہ ایک ایک کر کے ملک کے تمام اداروں کو کمزور، مضمحل بلکہ تباہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور صرف اپنی ذات کو استحکام کا ذریعہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نشانہ دستور بنا، پھر سیاسی جماعتوں کی باری آئی۔ الیکشن کے نظام کو صدارتی ریفرنڈم اور پھر ۲۰۰۲ء کے قومی اور صوبائی انتخابات کے موقع پر من مانی اور ایجنسیوں کی دراندازی کی آماج گاہ بنا دیا گیا۔

● **دستور کی پامالی:** ۲۰۰۲ء میں پارلیمنٹ وجود میں آئی، مگر اس طرح کہ پہلے سال تو صرف احتجاج ہوتا رہا۔ باقی چار برسوں کی کارکردگی بھی مایوس کن رہی ہے۔ صدر نے پارلیمنٹ کو خطاب کرنے کی دستوری ذمہ داری چار سال تک پوری نہیں کی اور پارلیمنٹ کو 'غیر مہذب' کہہ کر نظرانداز کر دیا۔ قانون سازی کے لیے صدارتی فرمان کا راستہ اختیار کیا اور ۷۵ فی صد قانون سازی آرڈی ننس کے ذریعے ہوئی۔ سیاسی جماعتوں کو توڑ پھوڑ اور ضمیروں کی کھلی خرید و فروخت کے ذریعے اپنی گرفت میں رکھا گیا۔ قومی اسمبلی کے پانچ سال پورے کرنے کو ایک کارنامے کے طور پر تو پیش کیا جا رہا ہے لیکن اس کا کوئی ذکر نہیں کیا جا رہا کہ اسمبلی نے کتنے دن کام کیا؟ کتنے گھنٹے اپنے فرائض منصبی پورے کرنے کے لیے صرف کیے، کتنی بار کورم ٹوٹا، کُل ارکان میں سے کتنے ایسے ہیں جنھوں نے پانچ سال میں کوئی ایک تقریر بھی نہیں کی، ایک سوال نہیں پوچھا، ایک تحریک نہیں پیش کی؟ اور پھر اسمبلی نے آخری ایام میں ایک نااہل شخص کو صدر منتخب کر کے اور ایمرجنسی اور دستور کی معطلی کی تائید کر کے اپنے منہ پر کتنی کالک ملی؟ پارلیمنٹ کے ادارے کو نیم جان کرنے کے ساتھ ریاست کے دوسرے بنیادی ستون عدلیہ کے ساتھ جو کچھ کیا گیا، وہ عبرت ناک ہے۔ اپنی مرضی کے لوگوں کو عدالت میں مقرر کرنے، چیف جسٹس کو دو بار اور دوسرے ۵۴ ججوں کی برطرفی (جو کُل اعلیٰ عدالتی ججوں کا ۶۰ فی صد ہیں) ایک ایسا مجرمانہ فعل ہے جو تاریخ میں سیاہ ترین باب کی حیثیت رکھے گا، اور جس کی مذمت پوری دنیا میں ہوئی ہے۔

● **انتظامیہ کی بے توقیری:** انتظامیہ کو اپنی ذاتی پسند اور ناپسند کا تابع بنانا، سرکاری

ملازمین کے تبادلے، برطرفی اور ان سے وہ کام لینا جو ان کے منصب سے مطابقت نہیں رکھتا، انتظامیہ کو تباہ کرنے کا نسخہ ہے۔ پھر پبلک سروس کمیشن کو اس زمانے میں عضو معطل بنا دیا گیا۔ اس کے دائرہ کار کو محدود، اس کے ارکان کی مدت کی تخفیف، اس کو نظرانداز کر کے بلکہ اس کی سفارشات کے برعکس تقرریاں، فوج کے حاضر سروس اور ریٹائرڈ افراد کا تقرر ـــــ کس کس بات کا رونا رویا جائے۔

● **آزادیِ اظہار پر قدغن:** میڈیا ریاست کا ایک چوتھا ستون ہے اور اس کی آزادی اور چینلوں کی ترویج کو اپنے 'بڑے کارناموں' میں پیش کیا جاتا ہے، مگر جس طرح میڈیا کو لگام دی گئی، ویج بورڈ کے ساتھ جو کچھ کیا گیا، 'پیمرا' نے کس طرح اخبارات اور ٹی وی چینلوں کو اپنے شکنجے میں کسا، پولیس نے کس طرح آزاد میڈیا پر یورش کی، ضمیر خریدنے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلے گئے، براہِ راست ٹیلی کاسٹنگ کا کس طرح گلا گھونٹا گیا، صحافیوں پر قید و بند اور ظلم و تشدد کے کون کون سے ہتھکنڈے استعمال کیے گئے ـــــ اور پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار اس دور میں ایک دو نہیں ۲۴ صحافیوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ یہ ہے میڈیا کی 'آزادی' کی حقیقت جسے پرویزی دور کا کارنامہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

● **فوج بحیثیت ادارہ کی چیرہ دستی:** مسلح افواج کا محترم ادارہ جس نے اس دور کے حکمران کو اصل قوت فراہم کی، وہ بھی اس دور کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہ رہا۔ جو فوج دفاعِ وطن کے لیے تیار کی گئی تھی اسے ان دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا، جن کے لیے وہ بنائی ہی نہیں گئی تھی اور نہ اس کی اہلیت رکھتی تھی۔ نائن الیون کے بعد فوج کو آنکھیں بند کر کے امریکا کی 'دہشت گردی کے خلاف' نام نہاد جنگ میں جھونک دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں فوج کے اقدامات اور قوم کے احساسات کے درمیان دُوری رونما ہوئی۔ بلوچستان، وفاقی قبائلی علاقوں اور دوسرے مقامات پر فوج کے استعمال کی قوم ہی نے نہیں خود فوج نے بھی بھاری قیمت ادا کی ہے۔ ایک ہزار سے زیادہ فوجی جوانوں اور افسروں اور اس سے دوگنا یا اس سے بھی زیادہ سویلین افراد بشمول خواتین اور بچوں کی ہلاکت ایک قومی سانحہ ہے۔ اس سے کچھ کم سانحہ یہ نہیں کہ فوج کا جو وقار، اس سے جو محبت قوم کو تھی، اس میں نمایاں کمی آئی ہے۔ راے عامہ کے جائزوں کی رو سے ۱۹۹۹ء میں

۸۰ فی صد آبادی فوج کو سب سے محترم اور قابلِ اعتماد ادارہ قرار دیتی تھی جو ۲۰۰۷ء میں گر کر ۵۴ فی صد پر آ گئی ہے۔ یعنی فوج کے وقار میں ۴۰ فی صد کی واقع ہوئی ہے، جو بڑا قومی خسارہ ہے۔ بے اعتمادی اب یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ وزارتِ داخلہ کو چند ماہ قبل باقاعدہ یہ تحریری ہدایت جاری کرنی پڑی اور فوجی عام پبلک مقامات پر تنہا فوجی وردی میں نہ جائیں، انا للّٰہ وانا الیہ رٰجعون!

ہم نے دل کڑا کر کے یہ صورت حال بیان کی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ پرویزی دور میں ریاست کے تمام ہی ادارے مجروح اور متزلزل ہو چکے ہیں گویا ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

۵- وفاق کا کمزور ہونا: اس دور کا پانچواں تحفہ فیڈریشن کی کمزوری ہے۔ اولین دو مارشل لا، وہ تاریک ادوار ہیں، جب مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں بے اعتمادی اور مغائرت واقع ہوئی اور بالآخر بھارت نے اپنی پاکستان دشمنی میں اس کا فائدہ اٹھایا اور قائداعظم کا پاکستان دولخت ہوگیا۔ مشرف کے مارشل لا میں مرکز اور صوبوں کے درمیان بے اعتمادی اور دُوری کی نئی لہر اُبھری ہے اور خصوصیت سے بلوچستان اور سرحد کے صوبوں میں مرکز گریز رجحان میں اضافہ ہوا ہے۔ اکبر بگٹی جو اپنی قوم کا سردار ہی نہیں تھا بلکہ بلوچستان میں فیڈریشن کا نمایندہ بھی تھا، فوج کے ہاتھوں قتل ہوکر مرکز کے خلاف نفرت کا عنوان بن گیا ہے۔ اصلاحِ احوال کی ہر کوشش کو حکمران ٹولے نے سبوتاژ کیا اور بلوچستان اور صوبائی مفاہمت کے لیے پارلیمانی کمیٹی نے جو محنت کی، وہ سب رایگاں گئی۔ صوبوں کو اُن کے وسائل پر اختیار حاصل نہیں ہے اور دستور کے مطابق جو رائلٹی اور ملازمتوں میں حصہ انھیں ملنا چاہیے، وہ نہیں مل رہا، اور سارے دعووں کے باوجود حالات میں سرِمو فرق واقع نہیں ہو رہا۔ مرکز کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ وزیراعظم اور صوبائی حکومت کے باہم اتفاق راے سے بجلی کے نفع میں صوبہ سرحد کے حق کے تعین کے لیے جو ثالثی ٹربیونل بنا تھا اور جس کا متفقہ اوارڈ آیا، اس تک پر عمل نہیں کیا گیا۔

فیڈریشن آج جتنی کمزور ہے اتنی کبھی نہ تھی ـــــ یہ ہے اس دور کا حاصل!

۶- حقیقی معاشی ترقی سے محرومی: اس دور کا چھٹا تحفہ یہ ہے کہ معاشی اور

مالیاتی وسائل کا جو سیلاب آیا اور کسی محنت اور پالیسی کے نتیجے کے بغیر ۶۵ ارب ڈالر کی جو مالی کشادگی حاصل ہوئی، اسے حقیقی معاشی ترقی اور عوام کی خوش حالی کے حصول کے لیے استعمال نہیں کیا گیا۔ معاشی ترقی کا سارا رخ آبادی کے ۱۰ سے ۱۲ فی صد طبقات کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ باقی ملک کی عظیم اکثریت کے حصے میں جو کچھ آیا ہے وہ بے روزگاری، افراطِ زر، اشیاے ضرورت کی کمیابی، تعلیم اور صحت کی سہولتوں کا فقدان، زراعت کی ضرورتوں سے اغماض، تجارتی اور ادایگیوں کے عدم توازن میں ناقابلِ برداشت اضافہ، بیرونی دنیا پر انحصار کی محتاجی، ملکی اور بیرونی قرضوں میں بڑھوتری اور معیشت اور زندگی کی ہر سطح پر کرپشن میں محیرالعقول اضافہ ـــــ عام آدمی کی زندگی اجیرن ہوگئی ہے اور ۸۰ فی صد آبادی کے لیے حالات میں کوئی تغیر نہیں ہوا یا مزید خراب ہوگئے۔

پلاننگ کمیشن کا وہ سروے جس کی بنیاد پر دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ غربت میں کمی ہوئی ہے اس میں یہ صورت حال سامنے آئی ہے کہ آبادی کے ۵۰ فی صد کا دعویٰ ہے کہ اس کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ۲۸ فی صد آبادی کہتی ہے کہ ہمارے حالات بدتر ہوگئے ہیں اور جن کی حالت کسی درجے میں بہتر ہوئی ہے، وہ بمشکل ۲۰ سے ۲۳ فی صد ہے۔ اس میں بھی اوپر کے ۱۰ فی صد ہی اصل فائدہ اٹھانے والے ہیں۔ یہی بات عالمی بنک اور ایشیائی ترقیاتی بنک کے سروے سے معلوم ہوتی ہے۔ گویا معاشی ترقی کے سارے دعووں کے باوجود اس دور کا اصل تحفہ غریبوں کا غریب تر ہونا اور امیروں کا امیر تر بن جانا ہے۔

۷- **فوجی مداخلت کا دائرہ اثر بڑھانا:** پرویزی دور کا ساتواں تحفہ سیاست میں فوج کی مداخلت اور فوج کو سیاست، معیشت، انتظامیہ غرض ہر اہم شعبے میں ایک باقاعدہ رول ادا کرنے کی کوشش ہے، جس نے دستور میں طے کردہ نظامِ کار کو درہم برہم کر دیا ہے، اور فوج کے بارے میں جو تاثر عام ہے وہ سابق خارجہ سیکرٹری ڈاکٹر تنویر احمد خان کے ایک حالیہ مضمون میں کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> مسلح افواج پر الزام عائد کیا گیا ہے کہ ۲۰ ارب ڈالر کے برابر اثاثوں اور ایک کروڑ ۲۰ لاکھ ایکڑ اراضی کی مالک بن چکی ہے۔ چنانچہ وہ بدعنوانی کے معاملات میں سب سے زیادہ نمایاں ہو چکی ہے۔

اس جلتی پر تیل کا کام پرویز مشرف کے اس فلسفے نے کیا ہے کہ ملک میں اقتدار کے تین سرچشمے ہیں: صدارت، فوج کا سربراہ اور وزیراعظم جسے وہ Troika (تکونی حکمرانی) کہتے ہیں۔ وہ ان کے درمیان یک رنگی کو استحکام کی شرط قرار دیتے ہیں۔ اپنے اس فلسفے کا اظہار وہ بار بار کرتے رہے ہیں، لیکن اس کا تازہ ترین اعلان واشنگٹن پوسٹ اور بی بی سی کو انٹرویو میں کیا ہے۔ حالانکہ پارلیمانی جمہوریت میں اقتدار کا مرکز اور محور پارلیمنٹ اور ان کا منتخب کردہ وزیراعظم ہوتا ہے۔ دستور کے تحت صدر کو غیر متنازع شخصیت کا حامل ہونا چاہیے اور وہ فیڈریشن کی علامت ہے کسی حکمرانی کی تکون کا حصہ نہیں۔

رہی فوج تو دستور کے تحت وہ سول حکومت کے ماتحت ہے، خود مرکز اقتدار نہیں۔ بلاشبہہ 'نگرانی اور توازن' (checks and balances) کا نظام دستوری حکومت کا خاصہ ہے، لیکن 'نگرانی اور توازن' کا یہ نظام مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کے اختیارات کے ذریعے کارفرما ہوتا ہے۔ اس میں صدر اور فوج کا کوئی آزاد کردار نہیں۔ پرویز مشرف کے 'تکونی حکمرانی' کے تصور نے دستور کے طے کردہ نظام کو جس پر قوم کا اتفاق راے ہے اور جو ایک معاہدۂ عمرانی کی حیثیت رکھتا ہے، درہم برہم کر دیا ہے اور دراصل انتشار کی یہی اصل وجہ ہے۔ پرویز مشرف کی موجودگی میں دستور اپنی اصل شان میں کارفرما ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اصل مسئلہ دستور کی بحالی، عدلیہ کی ۲ نومبر ۲۰۰۷ء کی حیثیت میں بحالی اور فوج کو دفاع تک محدود کرنا ہے جس کے لیے پرویز مشرف کے تصور حکمرانی کو مکمل طور پر رد کرنا اور جو بھی اس کا داعی ہو اس کو اقتدار سے فارغ کرنا ضروری ہے۔

● **سیاسی جماعتوں کے بدلتے موقف:** ایمرجنسی کے نفاذ، دستور معطل کرنے، عبوری دستور نافذ کرنے، عبوری دستور کے نام پر اصل دستور میں ایسی بنیادی تبدیلیاں کرنے سے اس دستور کا حلیہ خراب ہو گیا ہے اور اس پر ایک 'تکون' کو مسلط کر دیا گیا ہے اور پھر اس مسخ شدہ دستور (vandalized constitution) کے تحت ان کی پسند کی عبوری حکومت اور ان کے انگوٹھے تلے کام کرنے والے الیکشن کمیشن کے ذریعے انتخابات کا ناٹک رچا کر اپنے نظام کو چلانے والے لوگوں کو منتخب کرانا ان کا ایجنڈا ہے۔ پرویز مشرف کی اصل ضرورت ایک ایسی تابع مہمل پارلیمنٹ اور ایسی تابع فرمان مرکزی اور صوبائی اسمبلیاں ہیں، جو اُن مذموم آمرانہ، غیر جمہوری اور

غیرقانونی مقاصد کو پورا کرسکیں۔ اپنی گرتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر وہ اپنے اصطبل میں کچھ اور گھوڑوں کا اضافہ تو کرنے کو تیار ہیں اور اس کے لیے امریکا کے اشارے یا حکم پر، کچھ دوسری لبرل اور سیکولر قوتوں کو اپنی شرائط پر شریکِ اقتدار کرنے کو بھی تیار ہیں، مگر وہ اپنے اندر دستور کی پاس داری کا کوئی داعیہ نہیں پاتے اور نہ عوام کے حقیقی نمایندوں کے اقتدار سنبھالنے کی ان کے نظام میں کوئی گنجایش ہے، اس لیے انھوں نے تین کام کیے ہیں:

ا- دستور میں ایسی تبدیلیاں، جن کے نتیجے میں یہ دستور پارلیمانی جمہوریت کے بجاے صدارتی اور شخصی حکمرانی کی راہ ہموار کرسکے اور کوئی ان پر گرفت کرنے والا نہ ہو۔ خصوصیت سے آزاد عدلیہ کو تباہ کرکے اپنے نامزد ججوں پر مشتمل ایسی عدلیہ کو وجود میں لانا، جو موم کی ناک ہو اور ان کے ہر اقدام پر مہرِ تصدیق ثبت کرنے والی ہو۔

ب- عبوری حکومت اور تابع فرمان الیکشن کمیشن اور انتظامیہ کے ذریعے ایسی قومی اور صوبائی اسمبلیوں کا انتخاب جو ان کے احکام کے مطابق خدمت انجام دے سکیں۔ آج خود پرویز مشرف کے اپنے سیاسی وجود کا انحصار ان کی مفید مطلب پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے وجود میں آنے پر ہے اور یہی وجہ ہے کہ انتخابات میں دھاندلی ان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گئی ہے۔

ج- امریکا اور مغربی اقوام سے اپنے لیے 'نئی زندگی اور ہنگامی غذا' کا حصول۔ اس سلسلے میں صدر بش اور کونڈولیزا رائس نے بالکل کھل کر تائید کردی ہے۔ بش نے ایک بار پھر پرویز مشرف کو جمہوریت پسندی کا سرٹیفیکیٹ جاری کیا ہے۔ امریکی نائب وزیرخارجہ باؤچر نے صاف کہا کہ انتخابات بے عیب نہیں ہوں گے، لیکن اس کے باوجود امریکا کے لیے قابلِ قبول ہوں گے (flawed but acceptable)۔ برطانوی ہائی کمشنر نے صراحت سے کہہ دیا ہے کہ عدلیہ کا مسئلہ پاکستان کا اندرونی مسئلہ ہے اور گویا عدلیہ کی آزادی اور عدلیہ کی ۲ نومبر کی پوزیشن میں بحالی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ دراصل مشرف صاحب کی شخصی آمریت کے جاری رہنے کی راہ میں سب سے بڑا خطرہ ایک تو عوامی غیظ و غضب ہے اور اس کے بعد عدلیہ کی اس شکل میں بحالی ہے جو ۲ نومبر ۲۰۰۷ء کو وجود تھی اور جس عدلیہ نے دستور سے ماورا اقدامات پر احتساب کا عمل شروع کردیا

تھا۔ نیز انتخابات میں دھاندلی (رگنگ) کے ذریعے من پسند (انجینیرڈ) نتائج حاصل کرنے کی راہ میں بھی سب سے بڑا خطرہ وہی عدلیہ تھی، جس نے اپنی آزادی کے مقام کو پہچان لیا تھا۔شخصی حاکمیت کے لیے دستور کی ایک محافظ عدلیہ ناقابلِ برداشت تھی، اور ہے۔اس کا بڑا تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ جمہوریت کا دعویٰ کرنے والے امریکا اور مغرب کے حکمران محض اپنے اپنے مفادات کے کھیل میں عدلیہ کی بحالی کے باب میں خاموش ہیں، اور ملک کی وہ تمام سیاسی قوتیں جو یا پرویز مشرف کے ساتھ شریکِ اقتدار رہی ہیں یا شرکت کی توقع رکھتی ہیں وہ بھی خاموش ہیں، یا کہہ مکرنیوں سے کام لے رہی ہیں۔ پیپلزپارٹی کی قیادت کا معاملہ اس سلسلے میں سب سے زیادہ مخدوش ہے۔ایک طرف بے نظیر صاحبہ سے ۷نومبر کو جب مشرف کی اہلیت اور نئے آرڈی ننس جیسے اہم مسائل کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ ''میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ گرفتار شدہ عدلیہ اس مسئلے کا فیصلہ کرے اور جو فیصلہ بھی وہ کرے وہ اسے قبول کرلیں گی''۔

پھر ۱۱نومبر کو بے نظیر صاحبہ، سپریم کورٹ کے ججوں کے رہایشی علاقے میں گئیں۔ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری سے نہ مل سکیں، مگر برملا کہا:

> چیف جسٹس افتخار محمد چودھری اور وہ تمام جج حضرات جنھوں نے پی سی او کے تحت حلف اٹھانے سے انکار کر دیا ہے، ان کو بحال کر دیا جائے اور اُن کی نظربندی کے احکامات واپس لیے جائیں۔

مگر پانچ چھے روز بعد ۱۶نومبر ۲۰۰۷ء کو ایک سیاسی زلزلہ آیا۔ جان نیگروپونٹے پاکستان پر نازل ہوئے۔ ۱۷نومبر کو انھوں نے بے نظیر صاحبہ سے ٹیلی فون پر بات کی اور پھر عدلیہ کی بحالی پر ان کا موقف تبدیل ہوگیا، بلکہ چارٹر آف ڈیمانڈ کے لیے بھی سب سے اہم اختلافی نکتہ یہی بن گیا کہ پیپلزپارٹی عدلیہ کی آزادی کی بات تو کرتی ہے مگر بحالی کو قبول نہیں کرسکتی اور بالآخر ۱۳دسمبر کو انھوں نے کراچی میں برملا کہہ دیا:

> جج حضرات آتے جاتے رہتے ہیں ___ جسٹس سلیم الزمان صدیقی اور ناصر اسلم زاہد کی طرح جنھوں نے پی سی او کے تحت حلف اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اگر کوئی جج سیاست کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنی سیاسی جماعت بنالے۔

یہ ہے وہ دل خراش داستان، جسے سمجھے بغیر انتخابات میں شرکت اور بائیکاٹ کے درمیان انتخاب کے فیصلہ کن رویہ کے بہت سے پہلو واضح نہیں ہوتے۔ پرویز مشرف کا ایجنڈا اور سیاسی جماعتوں میں سے کچھ کے بدلتے ہوئے موقف، اپنے اندر غور وفکر کے بہت سے گوشے رکھتے ہیں۔

موجودہ حالات کا تقاضا

پرویز مشرف کے اقتدار کے بچاؤ اور تسلسل کے عزائم کی تکمیل کا انحصار صرف ان تین چیزوں پر ہے، جس کا ہم بار بار ذکر کر رہے ہیں:

۱- عدلیہ ان کی تابع مہمل رہے، جو اسی وقت ممکن ہے جب ۲ نومبر کی عدلیہ بحال نہ ہو اور پرویز مشرف کے بنائے ہوئے دستوری عفریت (constitional monstocity) کو تحفظ حاصل رہے۔

۲- انتخابات کی منصوبہ بند دھاندلی (انجینیرڈ رگنگ) کے ذریعے ان کے مفید مطلب پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیاں وجود میں آجائیں۔

۳- امریکا اور مغربی اقدام کی تائید انھیں حاصل رہے۔

اس تجزیے کا ناقابلِ انکار منطقی تقاضا یہ ہے کہ ایسے انتخابات کے جال میں نہ پھنسا جائے، جو اس ایجنڈے کی تکمیل میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں اور ساری توجہ اس پر مرکوز کی جائے کہ:

○ عدلیہ اپنی اصل شکل میں بحال ہو اور پرویز مشرف کا بنایا ہوا یہ گھروندا زمین بوس ہوجائے تاکہ دستور کی اس شکل میں بحالی ہوسکے جو ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو اس کی تھی۔ خصوصیت سے جو اقدامات ۳ نومبر ۲۰۰۷ء سے ۱۵ دسمبر تک کیے گئے ہیں وہ کالعدم ہوں اور کسی شکل میں بھی ان کو تحفظ نہ دیا جائے، اس کے بغیر دستور کے تحت سیاسی نظام بحال نہیں ہوسکتا۔

○ انتخابات کا انعقاد دستور کے مطابق ہو اور اس صورت میں ہو کہ انھیں آزاد، منصفانہ اور شفاف قرار دیا جاسکے۔ اس کے لیے غیر جانب دار عبوری حکومت کی تشکیل، آزاد، بااختیار اور اعتماد کا حامل الیکشن کمیشن بشمول چیف الیکشن کمشنر اور اس کے ماتحت کام کرنے والی پوری انتخابی مشینری

کا شکوک و شبہات سے بالاتر ہونا ہے۔ نیز فہرستوں سے لے کر پولنگ اسٹیشنوں کی درستی، پولنگ کے انتظامات، بوگس ووٹ اور بوگس اسٹیشنوں کا سدباب اور صحیح گنتی وغیرہ تمام امور کا صحیح خطوط پر طے ہونا اور شفاف انداز میں ان پر عمل درآمد اور انتخابات کے موقع پر امن و امان اور قوت کا استعمال کرنے والے عناصر خصوصیت سے ایم کیو ایم اور وڈیروں اور چودھریوں کی پرائیویٹ افواج کے مقابلے کا انتظام شامل ہے۔

○ تیسری چیز انتخابی عمل میں بیرونی قوتوں اور ایجنسیوں کی دراندازی کا مکمل خاتمہ اور خصوصیت سے امریکا کے پاکستان کے اندرونی معاملات میں کردار کی نفی ___ امریکا اپنی نام نہاد جنگ کی خاطر پاکستان سے اپنی کالونی کے طور پر معاملہ کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے عوام جن کی ۹۴ فی صد آبادی امریکی کھیل پر سخت برہم ہے، اسے لگام دینا چاہتی ہے اور اپنی قسمت کے فیصلے اپنے ہاتھوں کرنا چاہتے اور ان افراد سے نجات کے لیے کوشاں ہیں جو واشنگٹن سے احکامات لے رہے ہیں یا لینے کے لیے تیار ہیں۔

۸ جنوری ۲۰۰۸ء کے انتخابات کے بارے میں ملک کی ہر جماعت ماسوائے مشرف حکومت کے سابقہ شرکا برملا اظہار کر رہی ہے کہ انتخابات کے آزاد اور منصفانہ ہونے کا کوئی امکان دُور دُور تک نہیں۔ حد یہ ہے کہ پرویزی جماعتوں میں سے بھی کچھ چیخ اُٹھی ہیں، جیسا کہ مسلم لیگ فنکشنل پنجاب کے صوبائی صدر احمد محمود کا بیان ہے جس میں انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ چودھری پرویز الٰہی اس وقت بھی عملاً وزیراعلیٰ کے طور پر کام کر رہے ہیں اور پوری انتظامی مشینری ان کے زیرتصرف ہے۔ اس پر دی نیشن نے اپنے ادارتی کالم میں یوں اظہار کیا ہے: ''احمد محمود کے بیان کا خصوصی وزن ہے کیونکہ اُن کی پارٹی صدر مشرف کی حمایت کر رہی ہے''۔

تقریباً تمام عوامی سروے یہی صورت حال پیش کرتے ہیں، انتخابات آزادانہ اور منصفانہ نہیں ہوسکتے، اور بائیکاٹ ہی وہ راستہ ہے جس سے بالآخر انتخابات کو آزاد اور شفاف بنانے کا کوئی امکان ہوسکتا ہے۔

آئی آر آئی کے سروے کے مطابق ۶۶ فی صد عوام کی رائے میں ایمرجنسی کے نظام تلے انتخابات آزادانہ اور منصفانہ نہیں ہوسکتے۔ گیلپ پول کے مطابق ۵۶ فی صد لوگ ۸ جنوری کے

انتخابات کے بائیکاٹ کے حق میں ہیں، جب کہ ۴۱ فی صد کا خیال ہے کہ الیکشن میں حصّہ لینا چاہیے۔ آئی آر آئی کے سروے کے مطابق ۶۲ فی صد افراد نے بائیکاٹ کے حق میں راے دی جب کہ ۳۷ فی صد نے اس کے خلاف راے دی۔ لطف کی بات ہے کہ پی پی پی اور مسلم لیگ ن دونوں کے حامیوں میں بائیکاٹ کے حق میں راے دینے والوں کی تعداد ۷۴ فی صد تھی۔ آئی آر آئی کے سروے میں ۷۲ فی صد نے پرویز مشرف کے خلاف ووٹ دینے کا عندیہ ظاہر کیا ہے کہ ان میں سے بھی ۶۱ فی صد بہت سختی سے پرویز مشرف کے دوبارہ منتخب ہونے کی مخالف ہیں جبکہ ۶۷ فی صد کی خواہش ہے کہ مشرف فوری طور پر مستعفی ہوجائیں۔ عوام پرویز مشرف اور بے نظیر صاحبہ کے اشتراک اقتدار کے بھی خلاف ہیں اور اس سروے میں ۶۰ فی صد نے مشرف اور بے نظیر کی مفاہمت کی مخالفت کی ہے۔

ملک اور ملک کے باہر تجزیہ نگاروں کی بڑی اکثریت بھی کھلے بندوں اس راے کا اظہار کر رہی ہے کہ انتخابات دھاندلی زدہ اور ناقابلِ اعتماد ہوں گے، اور نتیجتاً سیاسی صورت حال کے حل کے لیے غیر مؤثر ثابت ہوں گے۔ صرف چند آرا ملاحظہ فرمائیں:

> جوں جوں ۸ جنوری قریب آ رہی ہے دھاندلی کے الزامات میں قوت آتی جارہی ہے۔ بدھ کے روز نیویارک میں قائم حقوق گروپ نے کہا کہ آزاد اور شفاف انتخابات ممکن نہیں ہوں گے، کیونکہ حکومت نے ججوں اور وکیلوں پر کریک ڈاؤن کیا ہے۔ ہیومن رائٹس واچ کا کہنا ہے کہ ایمرجنسی کے اُٹھا لیے جانے کے بعد کئی جج اور وکیل ابھی تک گرفتار ہیں۔ یہ تو ایک غیر ملکی گروپ کے خیالات ہیں لیکن سیاسی جماعتیں بھی ہر روز اس خوف کا اظہار کر رہی ہیں کہ ۸ جنوری کے انتخابات میں دھاندلی ہوگی۔ (روزنامہ ڈان، ایڈیٹوریل ۲۱ دسمبر ۲۰۰۷ء)

سیاسیات کے پروفیسر محمد وسیم نے لکھا: ''اس پر کم و بیش اتفاق راے پایا جاتا ہے کہ پاکستان میں ۸ جنوری ۲۰۰۸ء کو ہونے والے انتخابات اپنی نوعیت کے لحاظ سے 'مذاق' ہوں گے''۔ (روزنامہ ڈان، ۱۲ دسمبر ۲۰۰۷ء)

واشنگٹن پوسٹ ۱۲ دسمبر ۲۰۰۷ء میں گریفے ودھ (Griffe Withe) نے لکھا ہے

کہ: ''آزاد ماہرین کا خیال ہے کہ اس کے بہت کم امکانات ہیں کہ انتخابات آزادانہ یا منصفانہ ہوں، نیز یہ کہ انتخابی نتائج کو تبدیل بھی کیا جاسکے گا اور ان کو عدالتوں میں چیلنج بھی نہ کیا جاسکے گا''۔

تمام اہم اخبارات و رسائل بشمول وال اسٹریٹ جرنل، دی گارڈین، بوسٹن گلوب، دی اکانومسٹ، فارن پالیسی بیک زبان انتخابات کے دھاندلی زدہ اور ناقابلِ اعتماد ہونے کی بات کر رہے ہیں اور یہی بات بے نظیر بھٹو صاحبہ اور نواز شریف صاحب بھی کہہ رہے ہیں۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنی واضح بات کے باوجود انھوں نے اپنی ہی قائم کردہ کمیٹی کے مرتب کردہ چارٹر آف ڈیمانڈ کو کیوں نظرانداز کر دیا جو انتخابات کو منصفانہ اور شفاف بنانے کے لیے تقریباً متفقہ طور پر تیار کیا گیا تھا، اور آنکھیں بند کر کے انتخابات میں کود پڑے، اور اس تاریخی موقع کو ضائع کر دیا جو بائیکاٹ کی شکل میں پرویز مشرف کے پورے کھیل کا پردہ چاک کرنے کا ان کو حاصل تھا۔

ملکی مستقبل پر نظر رکھنے کی ضرورت

ہماری بحث کا حاصل یہ ہے کہ غلط نظام کے تحت دھاندلی زدہ انتخابات میں شرکت سے یا اس کے بعد بننے والی اسمبلی کے ذریعے نظامِ کار کی درستی کا کوئی امکان نہیں، انتخابات کے بعد تبدیلی کا خیال محض ایک واہمہ ہے، کہ بار بار کے تجربوں کے بعد بھی ہماری سیاسی جماعتوں کی آنکھیں ابھی تک نہیں کھلیں، اور ایک ہی سوراخ سے بار بار ڈسے جانے کے لیے وہ بے چین ہیں۔ معیاری صورت صرف بائیکاٹ کی ہے، لیکن اس زریں موقع کو بیش تر سیاسی جماعتوں نے اقتدار میں شرکت کے خواب، یا اپنے جوشیلے کارکنوں کے دباؤ میں ضائع کر دیا۔ حالانکہ اے پی ڈی ایم، ججوں کی بڑی تعداد، پوری لیگل کمیونٹی اور سول سوسائٹی کے ذمہ داروں کے علاوہ آزاد سیاسی تجزیہ نگاروں نے بھی بروقت متنبہ کر دیا تھا کہ یہ الیکشن دھوکہ ہوں گے اور صرف تماشے (fair) کے معنی میں فیئر ہوسکتے ہیں! اس لیے کہ اب آزاد عدلیہ کے بغیر آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کے منعقد ہونے یا انتخابی بے ضابطگیوں اور غلط کاریوں کے سدباب کی کوئی سبیل نہیں ہوسکتی۔

ہمیں اعتراف ہے کہ یہ بڑا نازک اور مشکل مرحلہ تھا اور بلاشبہہ دونوں طرف کچھ نہ کچھ

دلائل اور سیاسی مصالح موجود ہیں۔ لیکن اس تاریخی لمحہ میں اصل انتخاب تو اصول اور مصلحت کے درمیان ہے۔ قوم کے سامنے مسئلہ ان دونوں میں سے کسی ایک راستے کو منتخب کرنے کا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ اے پی ڈی ایم کی بیش تر جماعتوں نے اصول کی سیاست کو، مفاد کی سیاست پر ترجیح دے کر قوم کے سامنے ایک ایسی متبادل سیاست کی راہ کو روشن کر دیا ہے، جس کی تمنا تو ۶۰ سال سے کی جا رہی تھی، مگر اس طرف مؤثر اور قابلِ لحاظ قوت کے ساتھ پیش قدمی نہیں ہو پا رہی تھی۔ نظریۂ ضرورت کی گرفت سے نکلنا آسان نہیں تھا اور انتخابی حلقے کے دباؤ (pressure) سے بالا ہو کر ملک اور قوم کی قسمت اور مستقبل کے ایک اصولی نقشے کے مطابق تعمیر کے جاں گسل راستے کی طرف پیش رفت کا فیصلہ بھی آسان نہیں تھا ___ لیکن وقت کی اصل ضرورت یہی تھی کہ وقتی فوائد کے مقابلے میں قوم کو اس کام اور جدوجہد کے لیے تیار کیا جائے جس کے بغیر اصول، انصاف اور حق پرستی پر مبنی نظامِ سیاست وجود میں نہیں آ سکتا۔ یہ فیصلہ انشاء اللہ ملکی سیاست میں ایک بالکل نئے باب کے اضافے کا موجب ہوگا۔

جن جماعتوں نے بائیکاٹ کا راستہ اختیار کیا ہے، ان کے عوام میں اثرات ہیں اور انھیں علم ہے کہ ان کے لیے ایک معتدبہ تعداد میں مرکزی اور صوبائی نشستیں جیتنا ممکن تھا، لیکن ان کی نظر صرف ۸ جنوری پر نہیں، بلکہ ملک کے مستقبل کے نظام اور عوام کے حقیقی مسائل اور ان کو حل کرنے والی قیادت اور جدوجہد پر ہے، فوری اقتدار یا اقتدار میں شرکت پر نہیں۔ محض اقتدار مطلوب نہیں، اقتدار وہی مطلوب ہے اور وہی ذریعہ خیر بن سکتا ہے جو ایک حقیقی اسلامی، جمہوری، وفاقی اور فلاحی معاشرے اور ریاست کے قیام کو آسان اور ممکن بنائے۔ اس کے لیے صحیح ایشوز کا تعین، صحیح موقف کا اختیار، صحیح خطوط پر عوام کی تنظیم اور ان مقاصد کے حصول کے لیے مؤثر سیاسی جدوجہد برپا کرنا ضروری ہے۔ کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ جو لوگ نظریاتی کارکن ہیں اور برسوں سے دعوتی اور سیاسی میدان میں کام کر رہے ہیں اور جو بائیکاٹ کے باوجود عوام میں ہیں اور عوام کو اپنے ساتھ لے کر چل رہے ہیں، انھیں وقتی اور ہنگامی قوتیں میدان سے باہر کر سکتی ہیں۔ ایسی قوتیں خودرو پودوں کی طرح اُبھرتی ہیں اور مرجھا جاتی ہیں، لیکن نظریاتی بنیادوں پر کام کرنے والوں کے کام کو الحمدللہ دوام حاصل ہے، اور بالآخر وہی کامیاب ہوں گے۔

● **بائیکاٹ، میدان چھوڑنا نہیں:** بائیکاٹ کے معنی میدان چھوڑنا نہیں، بلکہ میدان میں اور زیادہ سرگرمی کے ساتھ مصروفِ کار ہونا ہے۔ جیسا ہم نے عرض کیا یہ احتجاج کا ایک ذریعہ اور اصل مقاصد کی طرف لوگوں کو دعوت دینے کا اسلوب اور پروگرام ہے۔ اس کے ذریعے عوامی رابطے کی مہم اور زیادہ مؤثر بنائی جاسکتی ہے اور ۸جنوری کو بھی کامیابی سے مسخر کیا جاسکتا ہے۔ ۸جنوری کے بعد جو حالات رونما ہونے والے ہیں اور جو فیصلہ کن دور اس کے بعد شروع ہوگا، اس میں بھرپور کردار ادا کرنے کا آغاز اس بائیکاٹ کی مہم کا حصہ ہے۔ اس امر میں شبہے کی کوئی گنجایش نہیں کہ ۸جنوری کے انتخابات ایک دھوکا ہوں گے اور جو آج بڑے شوق سے ان میں حصہ لے رہے ہیں، وہ بھی اس ڈرامے کے بعد اپنی غلطی کو محسوس کر رہے ہوں گے۔ ان کے نتیجے میں جو پارلیمنٹ بنے گی وہ نہ قانونی طور پر جائز ہوگی اور نہ ملک کو قابلِ اعتماد رہنمائی ہی دے سکے گی۔ جن سات چیلنجوں کی ہم نے نشان دہی کی ہے وہ اور بھی زیادہ گمبھیر شکل اختیار کرلیں گے۔ حالات اشارہ کر رہے ہیں کہ دھاندلی کے باوجود اسمبلی میں غالباً کسی کو بھی واضح اکثریت حاصل نہیں ہوسکے گی جس کے بعد ایک طرف حکومت سازی کے لیے سیاسی انجینیرنگ کا نیا دور شروع ہوگا تو دوسری طرف شخصی آمریت کے خلاف اور حقیقی جمہوریت کے قیام، عدلیہ کی بحالی اور حقوق کے تحفظ اور سماجی انصاف کے حصول کی جدوجہد نئی قوت سے اُبھرے گی۔

● **سیاسی قیادت کا امتحان:** اس وقت ملک کی تمام سیاسی قوتیں اور جماعتیں چار گروپوں میں قوم کے سامنے آچکی ہیں۔ ایک گروپ وہ ہے جو پرویز مشرف کی اصل سیاسی فوج ہے اور جس میں مسلم لیگ ق، پیپلز پارٹی شیرپاؤ اور ایم کیو ایم شامل ہیں۔ یہ مشرف کے اصل ساتھی ہیں اور مشرف کے ساتھ ہی ان کا بھی زوال مقدر ہے۔

دوسری قوت پی پی پی، اے این پی، جمعیت علماے اسلام (ف) وغیرہم ہیں جو اپنے نظریاتی، سیاسی اور علاقائی اختلافات کے باوجود اشتراکِ اقتدار ہی کی راہ پر گامزن ہیں۔ یہ ایک طرح پرویز مشرف کے ساتھ بھی ہیں اور اس کی مخالفت کا بھی دم بھر رہے ہیں۔ مشرف کے دامِ سیاست میں داخل بھی ہوگئے ہیں اور اس کو توڑنے کی بھڑک کا بھی سہارا لے رہے ہیں۔ نیتوں کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، لیکن عملی سیاست کے نقطۂ نظر سے یہ مشرف ہی کے ایجنڈے پر اپنے

اپنے انداز میں کام کر رہے ہیں اور اسی کے دیے ہوئے نقشے میں اپنا مقام بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اور ان میں سے کچھ وہ بھی ہیں جو اپنی قیمت بڑھا کر اقتدار میں اپنا حصہ حاصل کرنے ہی کو اپنا اصل ہدف بنائے ہوئے ہیں۔ یہ سارے تضادات ان کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ یہ بظاہر 'اینٹی مشرف' ہیں لیکن فی الحقیقت 'پرومشرف' کردار ادا کر رہے ہیں ___ کل یہ مشرف کی ٹیم کا حصہ بھی بن سکتے ہیں اور اس سے الگ بھی راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔ گویا ع

جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

تیسرا گروہ وہ ہے جس کا مرکزی کردار مسلم لیگ (ن) ہے۔ اس نے اپنا اینٹی مشرف موقف برقرار رکھا ہے اور عدلیہ کی بحالی کو بھی اپنے ایجنڈے میں سرفہرست رکھا ہے۔ لیکن نظام باطل سے مزاحمت کے بجاے اس کے اندر جا کر تبدیلی کا راستہ چنا ہے، جس نے ان کو بھی تضادات کی دلدل میں جھونک دیا ہے اور ان کے لیے امکانات کی دنیا کو بھی محدود کر دیا ہے۔ ان کا یہ رویہ فکری اور عملی یکسوئی سے بھی محرومی کا باعث ہے۔ لیکن اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ ۸ جنوری کے بعد یا شاید اس کے بھی پہلے یہ اپنے لیے ایک دوسرے کردار کی تلاش پر مجبور ہو جائیں۔

رہا چوتھا گروہ تو وہ پوری یکسوئی کے ساتھ مشرف کے بنائے ہوئے نظام کو چیلنج کر رہا ہے اور دستور کی بحالی، عدلیہ کی آزادی اور ۲ نومبر کی حیثیت میں عدلیہ کی بحالی اور غیر جانب دار قومی حکومت کے ذریعے نئے انتخابات اور سیاسی دروبست کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔ کُل جماعتی جمہوری تحریک (اے پی ڈی ایم) اس سیاسی جدوجہد کی مرکزی قوت ہے، لیکن اس تحریک کی روحِ رواں طبقۂ وکلا، جج، طلباء صحافی اور سول سوسائٹی کے وہ تمام عناصر بھی ہیں جو ۹ مارچ سے سرگرم عمل ہیں اور سب مل کر دستور کی بحالی اور حقیقی جمہوریت کے قیام کے لیے ایک اصولی اور تاریخی جنگ لڑ رہے ہیں۔ یہ سب ایک ہی کارواں کا حصہ ہیں اور مشترکہ مقاصد کے لیے انھیں پوری ہمت اور حکمت سے اس جدوجہد کو اس وقت تک جاری رکھنا ہے، جب تک یہ مقاصد حاصل نہ ہو جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ کامیابی ان شاء اللہ اسی گروہ کا مقدر ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قوم میں صحیح شعور اور بیداری پیدا کی جائے اور مسلسل جدوجہد کا اہتمام کیا جائے تاکہ عوام کو وقتی سیاسی مصالح اور مفادات کے مقابلے میں ملک کے اصل ایشوز کا ادراک حاصل ہو۔

اس کام کو انجام دینے کے لیے فوری جدوجہد کے ساتھ لمبے عرصے کی منصوبہ بندی، تنظیم اور ہمہ گیر تحریک کا لائحہ عمل تیار کرنے اور اپنی صفوں کو مضبوط رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ لوگوں، جماعتوں اور گروہوں کو شریکِ جدوجہد کرنا ضروری ہے۔ پرویز مشرف نے ۹ مارچ کو اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لیے جو اقدام کیا تھا، اللہ تعالیٰ کی مشیت نے اسی اقدام کو اس کے تنزل اور پسپائی کا نقشِ اوّل بنا دیا۔ پھر ۳ نومبر کو جو کچھ کیا گیا، اس نے عالمی سطح پر پرویز مشرف کے پاؤں تلے سے زمین کھسکا دی۔ اب ۸ جنوری اور اس کے بعد جاری رہنے والی تحریک، مشرف سے نجات کے ساتھ ساتھ مفاد پرست سیاست سے بھی ملک اور قوم کی نجات کا ذریعہ بنے گی اور اصول پر مبنی سیاست کے دور کا آغاز ہوگا اور یہی وہ جوہری فرق ہے جو اشتراکِ اقتدار کے لیے کام کرنے والوں اور اصول اور نظامِ حیات کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرنے اور قربانیاں دینے والوں میں ہے۔ بائیکاٹ اس منزل کی طرف لے جانے والا پہلا قدم ہے اور ہماری دعا ہے کہ جو قدم اس حیات بخش منزل کے حصول کے لیے اُٹھ گیا ہے، اب اپنی اسی منزل کی طرف اس کی پیش قدمی پوری مستعدی کے ساتھ جاری رہنی چاہیے اس لیے کہ جدوجہد اور قربانی کے ذریعہ ہی قومیں عزت کا مقام حاصل کرتی ہیں۔ آج کا پیغام صرف ایک ہے ___ رفتار تیز کرو اور مزید تیز کرو کہ منزل دُور نہیں! ع

تیز ترک گام زن منزل ما دُور نیست

(کتابچہ دستیاب ہے۔ منشورات، منصورہ، لاہور)

کشمیر: مظلوموں کی پکار، حکمرانوں کا فرار

پروفیسر خورشید احمد

جموں و کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کا اہلِ پاکستان پر جو حق ہے، وہ انسانیت، اسلام، اخلاق اور سیاسی، معاشی اور تہذیبی اوامر اور تقاضوں (imperatives) ہر اعتبار سے محکم ہے۔ صد افسوس! ہماری موجودہ قیادت نے اس باب میں نہ صرف مجرمانہ غفلت برتی ہے، بلکہ عملاً فرار اور بے وفائی کی راہ اختیار کرلی ہے، جسے اللہ، ملت اسلامیہ پاکستان اور تاریخ کبھی معاف نہیں کریں گے ___ لیکن سوال غلط کار حکمرانوں کو معاف کرنے یا ان کے احتساب سے کہیں زیادہ کا ہے۔ جب کوئی قوم اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے کے بجاے دوسروں کے ہاتھ میں اپنی قسمت کا اختیار دے دیتی ہے تو اس کے مفادات، اس کی عزت، اس کی آزادی اور بالآخر اس کا وجود معرضِ خطر میں ہوتے ہیں۔ آج پاکستانی قوم کے سامنے ایک ایسا ہی چیلنج ہے ___ ۲۱ دسمبر کو عیدالاضحیٰ اور سنت ابراہیمی کی روشن مثال نے ہمارے ضمیر کو جھنجھوڑا ہے اور اس سلسلے میں کشمیر کے قائد اور کشمیریوں کی آرزوؤں کے ترجمان سید علی شاہ گیلانی نے جو پیغام اہلِ پاکستان کو بھیجا ہے، اس پر دل کی گہرائیوں سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ پاکستانی قوم اپنی تاریخی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے ایک بار پھر کمربستہ ہوجائے اور حکمرانوں کے فرار، بے وفائی بلکہ غداری کی تلافی کا سامان کرسکے۔ سب سے پہلے اس مردِ مجاہد کے بیان کا خلاصہ اس توجہ اور یکسوئی سے پڑھ لیجیے کہ ہر لفظ دل میں اُتر جائے۔ اس لیے کہ یہ پیغام جس داعیِ حق کا ہے، وہ آج اقبال کے اسی شعر کی زندہ تصویر بنا ہوا ہے ؎

ہوا ہے گو تُند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

''کشمیریوں کو نہ بھارت ظلم وستم سے جھکا سکا ہے اور نہ پاکستان کے حکمرانوں کی بے وفائی ہمیں اپنی منزل سے مایوس کر سکے گی۔ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے اور افسوس اس قلعے کے محافظ مسلسل پسپائی کی پالیسی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ہم اول روز سے پاکستانی ہیں اور خون کے آخری قطرے تک پاکستان کی بقا، سالمیت اور تکمیل کی جنگ لڑتے رہیں گے۔ جب میرے یہ حروف آپ کی نظروں سے گزر رہے ہوں گے، تو یقیناً مملکت خداداد پاکستان میں ہر جانب عید کی خوشیاں جلوہ گر ہوں گی۔ میں چشمِ تصور سے اپنے خوابوں کی سرزمین کو دیکھتا رہتا ہوں۔ قیامِ پاکستان سے قبل میں نے ابتدائی تعلیم لاہور سے حاصل کی تھی، اور ۶۰ برس گزر جانے کے باوجود وہ مناظر، گلیاں، بازار اور کوچے دل و نگاہ میں بس رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم پاکستان سے جنون کی حد تک محبت کرتے ہیں اور یہ محبت کسی زمین، رنگ، نسل، زبان کی وجہ سے نہیں ہے۔ یہ وہ محبت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے رشتے سے ہمارے دلوں میں جاگزیں کیا۔ ہم چاہتے ہیں کہ اگر اس وقت میں قومی اور ملّی اُمنگوں کے مطابق مسئلہ کشمیر کا حل ممکن نہیں تو اس مسئلے کا نامناسب حل مسلط کرنے کے بجاے مناسب وقت کا انتظار کیا جائے۔ ہم نہ تھکے ہیں اور نہ ہمت ہاری ہے۔ ہمارے جذبے ماند نہیں پڑے۔ ہمارے جوان، بوڑھے اور عفت مآب خواتین ہمت اور حوصلے کے ساتھ برسرِ پیکار ہیں۔ عید کے موقع پر میں تمام اہلِ پاکستان کو حریت کانفرنس اور ریاست جموں و کشمیر کے وفاشعاروں کی طرف سے عید مبارک کہتا ہوں''۔

اقبال نے صرف یہ نوحہ ہی نہیں کہا تھا کہ ؎

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

بلکہ یہ دعوت بھی دی تھی کہ ؎

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

۲۵ دسمبر کو ہم نے قائداعظم کا یومِ پیدایش بھی منایا ہے، لیکن اصل ضرورت یہ ہے کہ آج ہم کشمیر کے بارے میں قائداعظم کے وژن، عزائم اور پالیسی خطوط کار کو ایک بار پھر ذہنوں میں تازہ کریں تاکہ قوم مسندِ اقتدار پر براجمان ٹولے کی آزادی کش، بھارت نواز اور دینی اور ملّی تقاضوں کے شعور سے محروم پالیسیوں اور پسپائیوں کا راستہ ترک کر کے، اللہ پر بھروسے اور اپنی تاریخی

ذمہ داریوں کے احساس کے ساتھ اصول اور حقیقی ملّی مفاد پر مبنی جرأت مندانہ پالیسیاں اختیار کرسکے۔

ہم کشمیر کے سلسلے میں قائداعظم کے چند بیانات، بلکہ احکام و ہدایات کو زمانی ترتیب کے ساتھ پیش کر رہے ہیں اور قوم کو یاد دلا رہے ہیں کہ قائداعظم نے وہی کہا تھا جو آج سید علی گیلانی کہہ رہے ہیں، اور کشمیر کے غیور مسلمان، جناب گیلانی اور حزب المجاہدین کی قیادت میں عملاً قائداعظم ہی کے احکام پر عمل پیرا ہیں، جب کہ قائد کا نام لینے اور ان کے مزار پر چادر چڑھانے اور گارڈز کی ڈیوٹیاں تبدیل کرانے والے حکمران ان احکام کی کھلی کھلی خلاف ورزی اور پاکستان اور مسلمانانِ جموں و کشمیر سے بے وفائی کا راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔

جموں و کشمیر میں مسلمانوں کی تحریکِ مزاحمت و حریت ۱۹۳۰ء کے عشرے میں شروع ہوئی اور ڈوگرہ مظالم بھی اسی وقت سے ہر حد کو پار کر گئے۔ قائداعظم نے آل انڈیا مسلم لیگ کے پٹنہ اجلاس میں ۲۶ دسمبر ۱۹۳۸ء کو فرمایا:

> میں کانگریس سے پوچھتا ہوں کہ وہ کشمیر میں کیا کر رہی ہے؟ آریہ سماجی، ہندو مہاسبھائی، کانگریسی قوم پرست اور کانگریسی اخبارات، یہ سب کشمیر کے معاملے میں کیوں چپ سادھے بیٹھے ہیں۔ کیا اس وجہ سے کہ کشمیر ہندو ریاست ہے؟ یا اس وجہ سے کہ کشمیر کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے؟

افسوس کہ آج خود مسلمان حتیٰ کہ پاکستانی مسلمان اور خصوصیت سے وہ قیادت جس کا فرض کشمیر کی تحریک حریت کی پشتی بانی ہے، چپ سادھے بیٹھی ہے۔ قائداعظم کی روح آج خود ہم سے، پاکستان کی موجودہ قیادت سے وہی سوال کر رہی ہے جو ہندو قیادت سے ۱۹۳۸ء میں کیا تھا!

۱۹۴۴ء میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سپاس نامے کا جواب دیتے ہوئے قائداعظم نے کشمیر کے بارے میں فرمایا:

> مسلمان جغرافیائی حدود کے قائل نہیں ہیں۔ اس لیے اسلامی برادری کے نام پر ہندستان کے مسلمان آپ کی مدد کے لیے کمربستہ ہیں۔ اگر آپ پر ظلم ہوا یا آپ سے بدسلوکی کی گئی تو ہم بے کار تماشائی کی صورت میں نہیں رہ سکتے۔ ایسی صورت میں برطانوی ہند کے مسلمان آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہو جائیں گے۔ کیونکہ بحیثیت مسلمان ہم

آپ کی مدد کے پابند ہیں۔

آج ہمارے حکمران 'جہاد' کے لفظ سے خائف اور اس پر شرمندہ ہی نہیں ہیں، بلکہ اپنی آزادی کی جنگ لڑنے والوں اور ان کی مدد کرنے والوں کو 'دہشت گرد' تک قرار دے رہے ہیں۔ لیکن دیکھیے جب اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کے لیے قبائلی مسلمان، وہی قبائلی مسلمان جن پر آج امریکا کی خوش نودی کے حصول یا اس کے حکم کے تحت پاکستانی فوج کو بم باری اور آگ اور خون کی ہولی کھیلنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے، ان قبائلی مسلمانوں نے کشمیر کے جہاد میں شرکت کی اور اس پر جب بھارتی گورنر جنرل نے ان کے خلاف اقدام کا مطالبہ کیا تو قائداعظم نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کیا فرمایا:

'ہم اس کی ذمہ داری لینے پر تیار نہیں اور نہ ہم قبائلیوں پر دباؤ ڈال سکتے ہیں کہ وہ کشمیر کو خالی کر دیں۔ مسلمانانِ کشمیر نے ڈوگرہ آمریت سے تنگ آ کر ہری سنگھ کی گورنمنٹ کو فتح کرنے کے لیے جہاد شروع کر رکھا ہے اور قبائلیوں نے مجاہدین کا ہم مذہب ہونے کی مناسبت سے ان کی امداد کی ہے۔ لہٰذا ہم اس معاملے میں کسی قسم کا دخل دینے کو تیار نہیں ہیں۔ کیونکہ مجاہدین کی یہ جنگِ آزادی ہے اور کوئی آزادی پسند ملک آزادی کی خاطر لڑنے والوں کے مخالفین کے ہاتھ مضبوط نہیں کر سکتا۔ اس لیے جن قبائلیوں کو برطانوی حکومت نہ دبا سکی، ہم انھیں کیسے روک سکتے ہیں۔ وہ ایک نصب العین کے لیے نبرد آزما ہیں'۔

(۳ نومبر ۱۹۴۷ء کو قائداعظم اور ماؤنٹ بیٹن کے مابین ایک کانفرنس کی روداد ملاحظہ ہو: رشحات قائد، مرتبہ نجمہ منصور، العبد پبلی کیشنز، سرگودھا، ۱۹۹۲ء، ص ۱۶۷-۱۶۸)۔

اس موقع پر قائداعظم نے ماؤنٹ بیٹن سے بڑی صفائی سے یہ بھی کہا تھا:

عوام نے متعدد بار راجا سے اپیل کی کہ وہ پاکستان میں شامل ہو جائیں، لیکن راجا پر اس مسئلے کا اُلٹا اثر ہوا، اور اس نے عوام کی آواز کو طاقت کے بل پر دبانے کی کوششیں کیں۔ اس پر عوام نے بھی طاقت کا جواب طاقت سے دینا شروع کر دیا۔ جب راجا ان کی چوٹ برداشت نہ کر سکا تو اپنا اقتدار ختم ہوتے دیکھ کر اسے ہندستان میں شامل

ہونے کی سوجھی۔ دراصل کشمیر ہندستان میں شامل نہیں ہوا، بلکہ ہری سنگھ شامل ہوا ہے۔ جب ہندستان میں ہری سنگھ کی شمولیت کے خلاف کشمیری عوام ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہوگئے تو ان سے یہ راے طلب کرنے کی تجویز کہ وہ ہندستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا پاکستان میں، نہ صرف فریب بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے۔

کسی قسم کی لگی لپٹی رکھے بغیر قائداعظم نے ماؤنٹ بیٹن سے یہ بھی کہا: ''کشمیر جہاں اقتصادی اور معاشی لحاظ سے پاکستان کا ایک جز ہے۔ وہاں سیاسی اعتبار سے بھی اس کا پاکستان میں شامل ہونا ضروری ہے''۔ (رشحاتِ قائد، مذکورہ بالا)

کشمیر کے بارے میں قائداعظم کی پالیسی کیا تھی، اس کا اظہار انھی کے الفاظ میں ان کے معالج ڈاکٹر الٰہی بخش نے کیا ہے:

''کشمیر، سیاسی اور فوجی حیثیت سے پاکستان کی شہ رگ ہے۔ کوئی خوددار ملک اور قوم اسے برداشت نہیں کرسکتی کہ وہ اپنی شہ رگ دشمن کی تلوار کے آگے کردے۔ کشمیر پاکستان کا حصہ ہے۔ ایک ایسا حصہ ہے جسے پاکستان سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ کشمیر کا مسئلہ نہایت نازک مسئلہ ہے۔ لیکن اس حقیقت کو کوئی انصاف پسند قوم اور ملک نظرانداز نہیں کرسکتا کہ کشمیر تمدنی، ثقافتی، مذہبی، جغرافیائی، معاشرتی اور سیاسی طور پر پاکستان کا ایک حصہ ہے اور جب بھی اور جس زاویے سے بھی نقشے پر نظر ڈالی جائے، یہ حقیقت بھی اتنی ہی واضح ہوتی چلی جائے گی''۔ (قائداعظم کے آخری ایام)

یہی پاکستان کی وہ کشمیر پالیسی ہے کہ جس پر پوری قوم کو مکمل یکسوئی رہی ہے۔ تاریخی تسلسل کے ساتھ ہم اس پر قائم رہے ہیں اور اس کے حصول کے ۱۹۴۷ء سے جموں و کشمیر کے مسلمان جدوجہد کر رہے ہیں اور قربانیاں دے رہے ہیں۔ موجودہ حکمرانوں نے اس پالیسی سے انحراف اور بے وفائی کی ہے اور کشمیری مسلمانوں کو مایوس کیا ہے، لیکن الحمدللہ جموں و کشمیر کے مسلمانوں کی ہمتیں اب بھی جوان ہیں ___ کیا پاکستانی قوم قرآن کے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے اپنے مظلوم بھائیوں کا ساتھ نہیں دے گی؟

آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ

لڑو جو کمزور پا کر دبا دیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا! ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔(النساء ۴:۷۵)

وفاقی شرعی عدالت کا ایک تاریخی فیصلہ

اسلام مساواتِ مرد وزن کا علَم بردار ہے، مگر اس کا یہ تصور اس الٰہی قانون پر مبنی ہے، جس کی رُو سے خالق کائنات نے تمام انسانوں کو بحیثیت انسان ایک ہی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ ان کے درمیان فطری صلاحیتوں اور سماجی اور تہذیبی ذمہ داریوں کے باب میں تو فرق اور تنوع ہوسکتا ہے مگر قانونی اور اخلاقی حیثیت کے اعتبار سے نہ مرد وزن میں فرق ہے اور نہ کالے اور گورے اور امیر اور غریب میں۔ لقد کرّمنا بنی 'ادم کے الٰہی حکم نے سب کو مساوی عزت کا مقام دیا ہے اور اس پہلو سے کسی بھی امتیازی یا ترجیحی سلوک کی کوئی گنجایش نہیں چھوڑی۔

پاکستان کا شہریت کا قانون مجریہ ۱۹۵۱ (Pakistan Citizenship Act) اینگلو سیکسن لا کی بنیاد پر بنایا گیا تھا۔ اس میں یہ سقم تھا کہ اگر ایک پاکستانی مرد کی کسی غیر پاکستانی عورت سے شادی ہو تو شادی کے بعد پاکستانی شوہر کی غیر پاکستانی بیوی کو شہریت کا حق حاصل ہو جاتا تھا۔ لیکن اس کے برعکس اگر ایک پاکستانی خاتون کی کسی غیر پاکستانی مرد سے شادی ہو تو پھر اس شوہر کو شہریت کا یہ حق حاصل نہیں تھا۔ یہ ایک ایسا امتیازی اور غیر منصفانہ قانون تھا کہ جس کا نہ اخلاقی اعتبار سے کوئی جواز تھا، اور نہ الٰہی قانون کی رو سے ایسے امتیاز کے لیے کوئی گنجایش تھی۔ لیکن حقوقِ نسواں کے علَم بردار اس مسئلے کے بارے میں خاموش تھے۔ حالانکہ ۲۰۰۰ء میں قائم ہونے والے ایک اعلیٰ اختیاراتی ادارہ یعنی 'نیشنل کمیشن اَون دی اسٹیٹس آف ویمن' نے بھی اپنی رپورٹ میں اس امتیازی سلوک کی نشان دہی کی تھی اور اس سلسلے میں ضروری قانون سازی کی طرف متوجہ کیا تھا۔ نیز پاکستان، اقوام متحدہ کے Convention on Elimination of All Forms of Discrimination Against Women پر دستخط کر کے بھی عورتوں کے اس حق کو تسلیم کر چکا

ہے، مگر پھر بھی اس کنونشن کا اطلاق پاکستانی خاتون کے غیر پاکستانی شوہر پر نہیں کیا گیا۔

پچھلے دنوں اخبارات میں خبر آئی کہ اس قانونی سقم کی وجہ سے بہت سی پاکستانی خواتین اپنے شوہروں کو پاکستان کی شہریت نہ دلوانے کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہیں، اور متاثرہ شوہروں کے پاکستان میں قیام کے باب میں انھیں شدید پریشانیاں درپیش ہیں۔ 'روشن خیالی' کے اس پرویزی دور میں نہ 'روشن خیال' حکومت کو اس مسئلے کا شعور تھا اور نہ 'روشن خیال' این جی اوز ہی کی نگاہ میں اس کی کوئی اہمیت تھی اور اس کا بڑا سبب یہ بھی تھا کہ اس قانونی سقم سے متاثر خواتین کا تعلق غالباً اُونچے طبقات سے نہیں تھا۔

وفاقی شرعی عدالت نے اس امتیازی سلوک کا ازخود (Suo Moto) نوٹس لیا اور دسمبر ۲۰۰۷ء کے دوسرے ہفتے میں شرعی عدالت کے فل بنچ نے قانون کے اس حصے کو اسلام کے قانون اور اقدار سے متصادم قرار دیا ہے اور حکومت کو ہدایت کی ہے کہ ۶ ماہ کے اندر اندر شہریت کے قانون میں ضروری ترامیم کر کے شادی شدہ پاکستانی عورت کو بھی وہی حقوق دے، جو شادی شدہ پاکستانی مرد کو حاصل ہیں۔

عدالت کا یہ فیصلہ کئی اعتبار سے اہم ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ مرد و زن کے حقیقی حقوق کا مسئلہ مغرب کا مسئلہ نہیں، ہمارا اپنا مسئلہ ہے اور ایسے تمام مسائل کو اسلام کے قانونی ڈھانچے اور اس کی روح کے مطابق حل کیا جانا چاہیے۔

دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ حکومت اپنے تمام دعووں کے باوجود نہ عورتوں کے حقوق کے بارے میں اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہی ہے، اور نہ مردوں اور خصوصیت سے کمزور انسانوں اور طبقات کے حقوق کا تحفظ کرنے کو تیار ہے۔ عام عدالتیں بھی اس باب میں خاموش ہی رہی ہیں۔ یہ توفیق وفاقی شرعی عدالت کو حاصل ہوئی ہے۔ جس نے اس سقم کا نوٹس لیا اور اس کی اصلاح کے لیے قانونی کارروائی کی۔ دیکھیں اب بھی حکومت اس پر کہاں تک عمل کرتی ہے۔ ہمارے علم میں وفاقی شرعی عدالت کے کئی ایسے فیصلے ہیں جن میں وہ وقت کے تعین کے ساتھ قانون میں شرعی بنیادوں پر تبدیلی کا حکم دے چکی ہے، مگر حکومت یا تو اپیل میں چلی گئی یا ان فیصلوں کو نظرانداز کر دیا گیا۔ مثلاً 'زنا' کے قانون کے بارے میں وفاقی شرعی عدالت کا کم از کم ایک فیصلہ ایسا ہے، جس

میں قانون کی تبدیلی کے لیے وقت کے تعین کے ساتھ ہدایات دی گئی تھیں، مگر انھیں نظرانداز کر دیا گیا۔ یہی معاملہ فیملی آرڈی ننس کے بارے میں عدالت کے احکام کے ساتھ ہوا ہے ___ یہ ہے ہمارے لبرل طبقے کی مساواتِ مرد و زن اور حقوقِ نسواں کے باب میں سنجیدگی کا حال۔

تیسرا قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ مشرف حکومت جو عورتوں کی 'خود اختیاریت' کا بہت واویلا کرتی ہے اور اسی کے نام پر اسمبلیوں میں خواتین کی ایک بڑی تعداد بھی موجود ہے، لیکن ان سب کی طرف اس ضمن میں کوئی پیش قدمی نہیں کی گئی اور اگر کسی نے پہل کی بھی تو وہ وفاقی شرعی عدالت ہے۔ وہ شریعت کورٹ جسے عورتوں کے حوالے سے لبرل طبقے نے مطعون کرنے کی مذموم کوشش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

ایک چوتھا پہلو یہ بھی ہے کہ آج کل عدالتِ عالیہ کو اس طرح سے ازخود امور کو زیرغور لانے اور حقوق انسانی کے باب میں مداخلت کرنے اور اصلاح کرانے پر بڑی لے دے کی جارہی ہے، بلکہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری اور ان کے ساتھیوں کو تو اس کی سزا دی جارہی ہے۔ حالانکہ جیسا کہ حالیہ مثال سے ظاہر ہوتا ہے، عدالت اپنے ازخود سماعت کے دستوری اختیارات سے عوام کے لیے دادرسی کی مفید خدمات انجام دے سکتی ہیں اور اس طرح انتظامیہ کی غفلت کا کچھ علاج بھی ہوسکتا ہے۔

ویسے تو ہمارا لبرل اور روشن خیال طبقہ مساواتِ مرد و زن کے شب و روز نعرے لگانے کا مرغوب شغل اپنائے ہوئے ہے، لیکن تعجب ہے وفاقی شرعی عدالت کے اس فیصلے کو لبرل پریس (صرف ایک انگریزی روزنامے *The News* کی استثناء کے ساتھ) نے چھاپنے تک کی زحمت گوارا نہیں کی۔

اگر یہی فیصلہ کوئی لبرل کورٹ کرتی تو شادیانے بجائے جاتے۔ لیکن چونکہ یہ خدمت وفاقی شرعی عدالت نے انجام دی ہے، اس لیے ان کے لیے یہ ایک ناقابلِ ذکر اور ناقابلِ التفات قدم ہے یا کہیں ایسا تو نہیں کہ بُغض اب اس مقام تک پہنچ گیا ہے کہ ؎

واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

آزادیِ راے اور تضحیک مذہب

امجد عباسی

اسلام، نبی کریمؐ اور مسلمانوں کو آزادیِ راے، آزادیِ صحافت، انسانی حقوق اور سیکولر جمہوریت کے نام پر تضحیک، تمسخر اور تذلیل کا برابر نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہیں کہ اس کا پشت پناہ مغرب ہے اور وہی اس کو تحفظ بھی دیتا ہے۔ بھارتی نژاد ملعون رشدی کے بعد بنگلہ دیش کی تسلیمہ نسرین (حال ہی میں ان کی متنازعہ کتاب دوئی کھنڈت پر بھارتی مسلمانوں کے ردعمل کا سامنے آنا)، ڈنمارک کے اخبار اور دیگر اخبارات میں شیطانی خاکوں کی اشاعت، ولندیزی فلم ساز تھیووان گوخ کی اسلام میں عورت کے مقام کے موضوع پر اشتعال انگیز فلم کی تیاری اور اس کے شدید ردعمل میں اس کی ہلاکت، جرمنی میں توہینِ رسالتؐ پر عامر چیمہ کی شہادت، اور اب سوڈان میں ایک عیسائی مشنری اسکول کی ٹیچر گللین گبنز کا اپنی کلاس کے طلبہ کو 'ٹیڈی بیر' کا نام (نعوذ باللہ) محمد صلی اللہ علیہ وسلم رکھنے کے لیے ورغلانے اور توہین رسالتؐ کا مرتکب ہونا، اسی کا تسلسل ہے۔ گللین گبنز کی سزا ختم کروانے اور تحفظ دینے میں بھی برطانیہ کا ہاتھ نمایاں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغرب کی طرف سے توہینِ اسلام اور توہینِ رسالتؐ میں کیوں شدت آتی جارہی ہے، اور دوسری جانب اس سب کچھ کو آزادیِ راے اور انسانی حقوق کے حوالے سے تحفظ دینے کی بات بھی کی جارہی ہے، نیز اُمت کے اہلِ علم اس مسئلے کا کس انداز سے جواب دیں؟

مغرب میں چند صدیاں قبل انسانی حقوق کا سوال اس وقت سامنے آیا جب یورپ میں سائنس اور مذہب میں چپقلش سامنے آئی۔ اس سے قبل یورپی تاریخ میں انسان کے بنیادی حقوق کا کوئی تصور نہیں ملتا۔ عیسائیت نے چند یونانی تصورات کو مذہبی تقدس کا مقام دے دیا اور سائنسی حقائق کو جھٹلاتے ہوئے انتہائی اقدامات اٹھائے اور ان عقائد کی خلاف ورزی کرنے پر سائنس دانوں کو پھانسی تک دے ڈالی۔ اس پر شدید ردعمل سامنے آیا اور اہلِ یورپ نے کلیسا کی بالادستی ختم کرنے کا فیصلہ کیا، نیز انسان کے بنیادی حقوق کے لیے مذہب سے ہٹتے ہوئے قانون سازی

کی بنیاد رکھی۔ سائنس کو اُلوہیت کا مقام دے دیا اور تجرباتی سائنس اور تجربہ و مشاہدہ کو علم کی بنیاد ٹھیرایا۔ عیسائیت کے غلط تصورات کی بنا پر مذہب سے بے زار اور بے نیاز ہو کر انسانی زندگی کے معاملات کو طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے نتیجے میں انسان کے بنیادی حقوق کے لیے قانون سازی عمل میں آئی۔ اس کا آغاز انگلستان کے میگنا کارٹا (۱۲۱۵ء) سے ہوا، اور مختلف مراحل سے گزرتا ہوا یہ عمل اقوام متحدہ کے منشورِ انسانی حقوق (۱۹۴۸ء) پر منتج ہوتا ہے۔

دوسری طرف مغرب اور امریکا کا اپنے مذموم مقاصد اور مفادات کے حصول کے لیے عدل و انصاف اور حقوق انسانی کی دھجیاں اڑا دینا، اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کی آڑ میں افغانستان اور عراق پر حملہ، گوانتانا موبے اور ابوغریب جیل میں تشدد کے انسانیت سوز واقعات، اور ایران پر حملے کی دھمکی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں بلکہ کھلی حقیقت ہے۔ ایسے میں اقوام متحدہ کے منشورِ انسانی حقوق، عدل و انصاف اور امن و امان جیسی اقدار پر عمل درآمد ایک سوال بن کر رہ جاتا ہے۔

قانونِ توہینِ رسالتؐ ہی کو لیجیے۔ نیو انسائی کلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق اکثر مشرقی اور یورپی ممالک میں قانونِ توہینِ انبیاؑ (بلاس فیمی لا) کسی نہ کسی صورت میں قابلِ مواخذہ جرم رہا ہے۔ آسمانی صحائف کو ماننے والی اقوام جہاں بھی حکمران رہی ہیں وہاں توہینِ رسالتؐ کی سزا، سزاے موت پر عمل درآمد ہوتا رہا ہے۔ یورپ اور امریکا اور دیگر سیکولر ریاستوں میں قانونِ توہینِ مسیحؑ (بلاس فیمی لا) اب بھی موجود ہے، اور اس حوالے سے ان ملکوں کی اعلیٰ ترین عدالتوں کے فیصلے بھی موجود ہیں۔ برطانیہ میں اٹھارھویں صدی تک توہینِ مسیحؑ کی سزا، سزاے موت تھی مگر بعد میں سزاے موت ختم کردی گئی، لہٰذا اب اس کی سزا عمر قید ہے۔

اس ضمن میں ایک معروف مثال یورپی یونین حقوق انسانی کی عدالت کا ۲۵ نومبر ۱۹۹۶ء کو برطانیہ کے حق میں دیا جانے والا فیصلہ ہے۔ اس کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ اس سے مجموعی طور پر مغرب کے نقطۂ نظر کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس مقدمے کے مطابق ایک برطانوی شہری نیگل ونگرو نے حضرت عیسٰیؑ کے حوالے سے ایک فلم دکھانے کی اجازت طلب کی۔ مگر یورپی یونین حقوق انسانی کی عدالت نے اس کی اجازت نہ دی کہ اس سے عیسائیوں کے جذبات مشتعل ہوں گے اور توہینِ عیسٰیؑ ہوتی ہے۔ مگر جب اس کیس میں سلمان رشدی کے خلاف توہینِ رسالتؐ

کا مسئلہ اٹھایا گیا تو اسے خارج از بحث قرار دے دیا گیا (دیکھیے: ناموسِ رسولؐ اور قانونِ توہین رسالت، محمد اسماعیل قریشی، ص ۲۳۴-۲۳۹)۔ یہاں مغرب کا دہرا معیار، انسانی حقوق اور اخلاقی اقدار کے تمام تر دعووں کے باوجود واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔

اسلام میں انسانی حقوق کا تصور مغرب سے بہت پہلے ۱۴ سو سال سے موجود ہے اور اس کا خلاصہ نبی کریمؐ کا خطبہ حجۃ الوداع ہے۔ اسلام بلاامتیاز مذہب و ملّت تمام انسانوں کے حقوق کی نہ صرف ضمانت دیتا ہے، بلکہ قوتِ نافذہ رکھتا ہے، اور قانونی چارہ جوئی کا حق بھی دیتا ہے۔ دوسری طرف اقوام متحدہ کے منشورِ انسانی حقوق کی حیثیت محض ایک اعلان سے بڑھ کر نہیں اور نہ اس کے نفاذ کو یقینی بنانے کے لیے کوئی ضمانت دی گئی ہے۔

اسلام نے جہاں رنگ و نسل کے فرق کی بنیاد پر انسانی تفاوت کو مٹایا ہے، وہاں تمام انسانوں کو اولادِ آدم ہونے پر برابر قرار دیا اور نیکی اور تقویٰ کو وجۂ امتیاز ٹھیرایا ہے۔ آزادیِ اظہارِ رائے کو شہریوں کا بنیادی حق ہی نہیں، بلکہ درپیش مسائل پر اظہارِ رائے کو مغرب کے تصور سے بڑھ کر، حق سے زیادہ فرض ٹھیرایا ہے۔ ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ بھلائی کی دعوت دے اور برائی سے روکے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اسی کا نام ہے۔ اس سے غفلت برتنا نہ صرف نفاق ہے، بلکہ اسے ملّت کے زوال کا ایک سبب بھی بتایا گیا ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل کی روش تھی کہ انھوں نے ایک دوسرے کو برے افعال سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ (المائدہ ۵:۷۹)

اسلام نے ضمیر اور اعتقاد کی آزادی کا حق دیا ہے۔ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ کفر و ایمان میں سے جو راہ چاہے اختیار کرلے۔ اسلام نے لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (البقرہ ۲:۲۵۶) کا اصول دیا ہے۔ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ مسلمانوں نے کبھی کسی قوم کو جبراً مسلمان نہیں کیا، بلکہ ذمی کی حیثیت سے ان کو مذہبی آزادی دی ہے اور ان کا تحفظ کیا ہے۔ اسلام نے تو مذہبی دلآزاری سے بھی منع کیا ہے۔

> وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ (الانعام ۶:۱۰۸) ان کو برا بھلا نہ کہو جنھیں یہ لوگ اللہ کے ماسوا معبود بنا کر پکارتے ہیں۔

خیال رہے کہ جہاں مذہبی دلآزاری سے منع کیا گیا ہے وہاں برہان، دلیل اور معقول طریقے

سے مذہب پر تنقید کرنا اور اختلاف کرنا آزادیِ اظہار کے حق میں شامل ہے۔ خود مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اہلِ کتاب اور دیگر مذاہب کے حاملین سے اگر گفتگو کی جائے تو تحمل اور رواداری کا مظاہرہ کیا جائے اور احسن انداز اپنایا جائے:

وَ لَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (العنکبوت ۲۹:۴۶)
اہلِ کتاب سے بحث نہ کرو مگر احسن طریقے سے۔

اسلام میں رواداری کا تصور یہ نہیں ہے کہ مختلف اور متضاد خیالات کو درست قرار دیا جائے۔ بقول سید مودودی: ''رواداری کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں کے عقائد یا اعمال ہمارے نزدیک غلط ہیں، ان کو ہم برداشت کریں، ان کے جذبات کا لحاظ کر کے ان پر ایسی نکتہ چینی نہ کریں جو ان کو رنج پہنچانے والی ہو، اور انھیں ان کے اعتقاد سے پھیرنے یا ان کے عمل سے روکنے کے لیے زبردستی کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ اس قسم کے تحمل اور اس طریقے سے لوگوں کو اعتقاد و عمل کی آزادی دینا نہ صرف ایک مستحسن فعل ہے، بلکہ مختلف الخیال جماعتوں میں امن اور سلامتی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ لیکن اگر ہم خود ایک عقیدہ رکھنے کے باوجود محض دوسرے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ان کے مختلف عقائد کی تصدیق کریں، اور خود ایک دستور العمل کے پیرو ہوتے ہوئے دوسرے مختلف دستوروں کا اتباع کرنے والوں سے کہیں کہ آپ سب حضرات برحق ہیں، تو اس منافقانہ اظہارِ رائے کو کسی طرح رواداری سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ مصلحتاً سکوت اختیار کرنے اور عمداً جھوٹ بولنے میں آخر کچھ تو فرق ہونا چاہیے''۔ (تفہیمات، اوّل، ص ۱۱۴-۱۱۵)

حقیقت یہ ہے کہ آزادیِ رائے، آزادیِ صحافت، انسانی حقوق اور لادین جمہوریت جیسی مغربی اقدار بظاہر دل کو بھاتی ہیں، عقل کو اپیل کرتی ہیں لیکن عملاً جب مفادات آڑے آئیں، نسلی و مذہبی تعصب سے واسطہ پڑے، انسانی حقوق اور عدل و انصاف پر زد پڑے تو یہ اقدار غیر جانب داری کے بجاے جانب داری کا مظاہرہ کرتی نظر آتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ محض عقلِ انسانی کو بنیاد بنا کر آزادیِ راے اور آزادیِ صحافت جیسی اقدار کے تحت توہینِ رسالت کا ارتکاب کیا جائے، اور اس کے نتیجے میں خواہ بڑے پیمانے پر جانی و مالی نقصان اور مسلمانوں کی دل آزاری اور فساد کا اندیشہ ہو مگر انسان کسی تحدید پر تیار نہ ہو--- یہی وہ مقام ہے جہاں انسان اگر ٹھیر کر نہیں سوچتا تو قرآن

کے مطابق انسان کی اس روش سے زمین میں فساد برپا ہوسکتا ہے۔ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ (الروم ۳۰:۴۱) ''خشکی اور تری میں فساد برپا ہوگیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے''۔ تہذیبوں کی جنگ کا واویلا بھی مچایا جا رہا ہے اور اسلام کو ہدف بنایا جا رہا ہے، حالانکہ اسلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تو آزادیِ اظہار کے تحت نہ صرف معقول اور منطقی انداز میں اختلافِ رائے کا حق دیتا ہے، بلکہ عقیدے کی آزادی اور تحفظ فراہم کرتا ہے۔

اس مسئلے کا اصولی حل یہی ہے کہ مغرب نے مذہبی تعصب کی وجہ سے عقل اور سائنس کو جس طرح خدا بنا رکھا ہے اور اسے اُلوہیت کا درجہ دے رکھا ہے، اس پر نظرثانی کرے۔ اگر یہ ماضی کے عیسائیت اور اہلِ کلیسا کے غلط نظریات کا ردعمل ہے تو اسلام کے حوالے سے ایسا سوچنا مناسب نہیں۔ اسلام ایک روایتی مذہب نہیں، بلکہ ایک دین اور ایک مکمل نظامِ حیات ہے جو ہرشعبۂ زندگی بہ شمول سائنس کے لیے ہدایات اور رہنمائی رکھتا ہے۔ اصولی طور پر بھی دیکھا جائے تو آزادیِ رائے، انسانی حقوق اور انسانیت کی فلاح کے لیے اسلام کی تعلیمات زیادہ جامع ہیں جنھیں عقل تسلیم کرنے پر مجبور ہے، جب کہ عیسائیت و دیگر مذاہب کی تعلیمات اس معیار پر پورا نہیں اترتیں۔ اگرچہ روسو نے یہ کہا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوا مگر اسے ہرجگہ زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے، تاہم یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے ۱۴سو سال پہلے یہ فرمایا تھا کہ تم نے انسانوں کو غلام کب سے بنا لیا؟ ان کی ماؤں نے تو انھیں آزاد جنا تھا۔ مگر اس جرأت کے لیے خدا سے ڈرنے والا دل اور وحیِ الٰہی پر ایمان لانے کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کو یہ خدشہ لاحق ہے کہ اسلام اپنی تعلیمات اور منطقی استدلال کی بناپر غالب نہ آجائے۔ اسلام کی نظریاتی بالادستی اور اسلامی تحریکوں کے تحت احیائے اسلام کے لیے برپا منظم جدوجہد، اور قبولِ اسلام کے بڑھتے ہوئے عالمی رجحان کی بناپر، مغرب کو یہ خدشہ یقین میں بدلتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ بقول اقبال ؏

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں

قیادت کا امتحان

قائدانہ اوصاف کی فہرست طویل ہوتی ہے۔ ہر اچھی صفت کا بدرجہ کمال موجود ہونا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ عملی دنیا میں قیادت کا امتحان اُس کے فیصلوں اور رویوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ ہر قائد اپنے تشخص کو بتدریج اجاگر کرتا ہے اور پھر اُس کے مطابق چلتا ہے۔

درج ذیل چار صورتوں میں قیادت کا امتحان سخت ہوتا ہے اور کمال کے حصول میں اہم کردار ادا کرتا ہے:

- **تبدیلی اور پھر واپسی**: تبدیلی ہمیشہ سوچ سمجھ کر کی جاتی ہے اور تبدیلی لاتے ہوئے بہت کچھ کر گزرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جب تبدیلی کے نتائج توقع سے کہیں کم نظر آئیں تو ایسے موقعے پر نیا فیصلہ چاہیے ہوتا ہے یا پرانی حالت میں واپسی ضروری ہوتی ہے۔ اس نوعیت کی اصلاح کے لیے حوصلہ درکار ہوتا ہے۔
- **استقلال**: تنظیم کی اٹھان اور ترقی جن بنیادوں پر ہوتی ہے اُن کا دفاع اور اُن کا احیا ضروری ہوتا ہے تاکہ ترقی کی راہیں مزید کھلتی جائیں۔ نتائج کے لیے بے صبری کی وجہ سے تبدیلی کا شوق' اگر بنیادوں کو مضمحل کر دے یا جڑوں کو کاٹ ڈالے تو یہ بہت برا سودا ہے۔ بنیادی اصول' مقاصد' اقدار پر استقلال قیادت کے کمال مرتبے کو ظاہر کرتا ہے۔
- **اَن کہے پر گفتگو**: اگر ٹیم کے کسی رکن کے ساتھ کسی موضوع پر بات کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہو یا جس موضوع پر بات کرنا جذباتی طور پر مشکل محسوس ہوتا ہو تو اُسی پر بات کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ایسے موضوع کو ٹالنا نہیں چاہیے۔ شاید وہی موضوع ایسا ہے جس پر کھل کر بات ہونا چاہیے اور مسئلہ وہیں اٹکا ہوا ہے۔ قیادت کا امتحان اسی میں ہے۔
- **تنظیم اور لچک**: تنظیم کا قائد غیر یقینی کو یقینی سے بدلتا ہے۔ پابندی اور سختی کے ذریعے سے یہ ممکن ہوتا ہے لیکن حالات اور کاموں کی نوعیت کے اعتبار سے نتائج کو مدنظر رکھ کر لچک اختیار کرنا بھی قیادت کا بڑا امتحان ہوتا ہے۔ اس لچک کا مقصد انتشار سے بچنا اور تنظیم کو فعال اور مؤثر بنانا ہوتا ہے۔

سنابل العلم

جب انتخابات کے ذریعے تبدیلی ناممکن بنادی جائے......

فی الواقع بکثرت لوگ اِس اُلجھن میں پڑ گئے ہیں، کہ آیا جمہوری طریقوں سے یہاں کوئی تبدیلی لائی جاسکتی ہے یا نہیں، اور ایک اچھی خاصی تعداد یہ سمجھنے لگی ہے کہ ایسے حالات میں غیر جمہوری طریقے اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ یہ بجائے خود ہمارے حکمرانوں کی بہت بڑی نادانی ہے کہ انھوں نے لوگوں کو اِس طرح سوچنے پر مجبُور کر دیا ہے۔ لیکن ہم اس پوری صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے اور اُس کی پیدا کردہ تمام صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے بھی اپنی اس راے پر قائم ہیں کہ اسلامی نظام، جسے برپا کرنے کے لیے ہم اُٹھے ہیں، جمہوری طریقوں کے سوا کسی دوسری صورت سے برپا نہیں ہوسکتا، اور اگر کسی دوسرے طریقے سے برپا کیا بھی جاسکے تو وہ دیرپا نہیں ہوسکتا۔

اس معاملے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے آپ جمہوری طریقوں کا مطلب واضح طور پر جان لیں۔ غیر جمہوری طریقوں کے مقابلے میں جب جمہوری طریقوں کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ نظامِ زندگی میں جو تبدیلی بھی لانا، اور ایک نظام کی جگہ جو نظام بھی قائم کرنا مطلوب ہو، اسے زور زبردستی سے لوگوں پر مسلط نہ کیا جائے، بلکہ عامۃ الناس کو سمجھا کر اور اچھی طرح مطمئن کر کے اُنھیں ہم خیال بنایا جائے اور اُن کی تائید سے اپنا مطلوبہ نظام قائم کیا جائے۔ اس کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ عوام کو اپنا ہم خیال بنا لینے کے بعد غلط نظام کو صحیح نظام سے بدلنے کے لیے ہر حال میں صرف انتخابات ہی پر اِنحصار کر لیا جائے۔ انتخابات اگر ملک میں آزادانہ و منصفانہ ہوں اور ان کے ذریعے سے عام لوگوں کی راے نظام کی تبدیلی کے لیے کافی ہو، تو اس سے بہتر کوئی بات نہیں۔ لیکن جہاں انتخابات کے راستے سے تبدیلی کا آنا غیر ممکن بنا دیا گیا ہو، وہاں جبّاروں کو ہٹانے کے لیے راے عامہ کا دباؤ دوسرے

طریقوں سے ڈالا جاسکتا ہے، اور ایسی حالت میں وہ طریقے پوری طرح کارگر بھی ہو سکتے ہیں، جب کہ ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی بھاری اکثریت اس بات پر تُل جائے کہ جبّاروں کا من مانا نظام ہرگز نہ چلنے دیا جائے گا اور اُس کی جگہ وہ نظام قائم کر کے چھوڑا جائے گا جس کے صحیح و برحق ہونے پر لوگ مطمئن ہو چکے ہیں۔ نظامِ مطلوب کی مقبولیت جب اِس مرحلے تک پہنچ جائے تو اس کے بعد غیر مقبول نظام کو عوامی دباؤ سے بدلنا قطعاً غیر جمہوری نہیں ہے، بلکہ ایسی حالت میں اُس نظام کا قائم رہنا سراسر غیر جمہوری ہے۔

اس تشریح کے بعد یہ سمجھنا کچھ مشکل نہ رہے گا کہ ہم اسلامی نظام برپا کرنے کے لیے جمہوری طریقوں پر اس قدر زور کیوں دیتے ہیں۔ کوئی دوسرا نظام مثلاً کمیونزم لوگوں پر زبردستی ٹھونسا جاسکتا ہے، بلکہ اس کے قیام کا ذریعہ ہی جبر اور جبّاریت ہے، اور خود اس کے ائمہ علانیہ یہ کہتے ہیں کہ انقلاب بندوق کی گولی ہی سے آتا ہے۔ اِستعماری نظام اور سرمایہ داری نظام اور فسطائی نظام بھی رائے عام کی تائید کے محتاج نہیں ہیں، بلکہ رائے عام کو طاقت سے کچل دینا اور اس کا گلا گھونٹ دینا ہی ان کے قیام کا ذریعہ ہے۔

لیکن اسلام اس قسم کا نظام نہیں ہے۔ وہ پہلے لوگوں کے دلوں میں ایمان پیدا کرنا ضروری سمجھتا ہے، کیونکہ ایمان کے بغیر لوگ خلوص کے ساتھ اُس کے بتائے ہوئے راستوں پر نہیں چل سکتے۔ پھر وہ اپنے اُصولوں کا فہم اور اُن کے برحق ہونے پر اطمینان بھی عوام کے اندر ضروری حد تک، اور خواص (خصوصاً کارفرماؤں) میں کافی حد تک پیدا کرنا لازم سمجھتا ہے، کیونکہ اس کے بغیر اُس کے اصول و احکام کی صحیح تنفیذ ممکن نہیں ہے۔ اس کے ساتھ وہ عوام و خواص کی ذہنیت، اندازِ فکر اور سیرت و کردار میں بھی اپنے مزاج کے مطابق تبدیلی لانے کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ یہ نہ ہو تو اس کے پاکیزہ اور بلند پایہ اصول و احکام اپنی صحیح روح کے ساتھ نافذ نہیں ہو سکتے۔ یہ جتنی چیزیں میں نے بیان کی ہیں، اسلامی نظام کو برپا کرنے کے لیے سب کی سب ضروری ہیں، اور اِن میں سے کوئی چیز بھی جبراً لوگوں کے دل و دماغ میں نہیں ٹھونسی جاسکتی، بلکہ اِن میں سے ہر ایک کے لیے ناگزیر ہے کہ تبلیغ، تلقین اور تفہیم کے ذرائع اختیار کر کے لوگوں کے عقائد و افکار بدلے جائیں، ان کے سوچنے کے انداز بدلے جائیں، ان کی اَقدار (values) بدلی جائیں، ان کے

اخلاق بدلے جائیں، اور ان کو اس حد تک اُبھار دیا جائے کہ وہ اپنے اُوپر جاہلیت کے کسی نظام کا تسلط برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ جمہوری طریقوں کے سوا اُس کے حصول کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے اور آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی نظام کو عملاً برپا کردینے کے لیے کوئی اقدام اُس وقت تک نہیں کیا جاسکتا جب تک اس مقصد کے لیے کام کرنے والوں کو اِس نوعیت کی عوامی تائید حاصل نہ ہو جائے۔

شاید آپ میری یہ باتیں سن کر سوچنے لگیں گے کہ اس لحاظ سے تو گویا ابھی ہم اپنی منزل کے قریب ہونا درکنار، اس کی راہ کے صرف ابتدائی مرحلوں میں ہیں، لیکن میں کہتا ہوں کہ آپ اَفراط وتفریط سے بچتے ہوئے اپنے آج تک کے کام کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں۔ جمہوری طریقوں سے کام کرتے ہوئے آپ پچھلے [برسوں] میں تعلیم یافتہ طبقے کی بڑی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنا چکے ہیں، اور یہ لوگ ہر شعبۂ زندگی میں موجود ہیں۔ نئی نسل، جو اَب تعلیم پا کر اُٹھ رہی ہے، اور جسے آگے چل کر ہر شعبۂ زندگی کو چلانا ہے، وہ بھی جاہلیت کے علَم برداروں کی ساری کوششوں کے باوجود زیادہ تر آپ کی ہم خیال ہے۔

اب آپ کے سامنے ایک کام تو یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے میں اپنے ہم خیالوں کی تعداد اِسی طرح بڑھاتے چلے جائیں، اور دوسرا کام یہ ہے کہ عوام کے اندر بھی نفوذ کر کے ان کو اسلامی نظام برپا کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تیار کرنے کی کوشش کریں۔ پہلے کام کے لیے لٹریچر کا پھیلانا آج تک جتنا مفید ثابت ہوا ہے اس سے بدرجہا زیادہ آیندہ مفید ثابت ہوسکتا ہے، اگر آپ اپنے ہم خیال اہلِ علم کے حلقے منظّم کر کے مختلف علوم کے ماہرین سے مسائلِ حیات پر تازہ ترین اور محققانہ لٹریچر تیار کرانے کا انتظام کریں۔ اور دوسرے کام کے لیے تبلیغ وتلقین کے دائرے وسیع کرنے کے ساتھ اصلاحِ خلق اور خدمتِ خلق کی ہر ممکن کوشش کیجیے۔ آپ صبر کے ساتھ لگاتار اس راہ میں جتنی محنت کرتے چلے جائیں گے اتنی ہی آپ کی منزل قریب آتی چلی جائے گی۔

رہا یہ سوال کہ جب تمام جمہوری اداروں کی مٹی پلید کر دی گئی ہے، شہری آزادیاں سلب کر لی گئی ہیں اور بنیادی حقوق کچل کر رکھ دیے گئے ہیں، تو جمہوری طریقوں سے کام کیسے کیا جاسکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام کا کام کرنے کے لیے کھلی ہموار شاہراہ تو کبھی نہیں ملی ہے۔ یہ کام تو جب بھی ہوا جبر وظلم کے مقابلے میں ہر طرح کی کڑیاں [سختیاں] جھیل کر ہی ہوا، اور وہ لوگ کبھی یہ کام نہ کرسکے جو یہ سوچتے رہے کہ جاہلیت کے علَم برداروں کی اجازت، یا ان کی عطا کردہ سہولت ملے تو وہ راہِ خدا میں پیش قدمی کریں۔ آپ جن برگزیدہ ہستیوں کے نقشِ پا کی پیروی کر رہے ہیں، اُنھوں نے اُس ماحول میں یہ کام کیا تھا جہاں جنگل کا قانون نافذ تھا اور کسی شہری آزادی یا بنیادی حق کا تصور تک موجود نہ تھا۔ اس وقت ایک طرف دل موہ لینے والے پاکیزہ اخلاق، دماغوں کو مسخر کر لینے والے معقول دلائل، اور انسانی فطرت کو اپیل کرنے والے اصول اپنا کام کر رہے تھے اور دوسری طرف جاہلیّت کے پاس اُن کے جواب میں پتھر تھے، گالیاں تھیں، جھوٹے بہتان تھے اور کلمۂ حق کہتے ہی انسانوں کی شکل میں درندے خدا کے بندے پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ یہی چیز درحقیقت اسلام کی فتح اور جاہلیّت کی شکست کا ذریعہ بنی۔

جب ایک معقول اور دل لگتی بات کو عمدہ اخلاق کے لوگ لے کر کھڑے ہوں، اور سخت سے سخت ظلم وستم سہنے کے باوجود اپنی بات ہر حالت میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے چلے جائیں، تو لازمی طور پر اس کے تین نتائج رونما ہوتے ہیں:

- ایک نتیجہ یہ کہ اس صورت حال میں بہت سے باہمت اور اُولوالعزم لوگ ہی اس دعوت کو علانیہ قبول کرتے ہیں اور وہ اس کے لیے ایسا قیمتی سرمایہ ثابت ہوتے ہیں جو کسی دوسری صورت میں بہم نہیں پہنچ سکتا۔
- دوسرا نتیجہ یہ کہ ظالموں کی پیدا کردہ اِس خوفناک فضا میں بکثرت، بلکہ بے اندازہ لوگ اس دعوت کو دل میں مان لیتے ہیں مگر آگے بڑھ کر اس میں شامل نہیں ہوتے۔ مخالف طاقت آخرکار اس کا خود نقصان اٹھاتی ہے۔ اسے قطعی اور حتمی شکست ہونے تک کبھی یہ پتا ہی نہیں چلنے پاتا کہ جس دعوت کو مٹا دینے کے لیے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے اس کے حامی کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ اُس کی اپنی صفوں تک میں موجود ہوتے ہیں اور وہ اُن سے بے خبر رہتی ہے۔
- تیسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اخلاقی برتری اور دعوت کی معقولیت وصداقت اپنی فطری

طاقت سے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس کے دشمن اُس کے پیروؤں پر جتنا زیادہ ظلم کرتے ہیں اُتنے ہی وہ ہر شریف النفس اور نیک طبع انسان کی نظر سے گرتے جاتے ہیں، اُس کے پیرو جتنی ہمت اور ثابت قدمی کے ساتھ ظلم برداشت کرتے چلے جاتے ہیں اور اپنی حق پرستی سے بال برابر بھی نہیں ہٹتے، اُتنی ہی ان کی قدر و منزلت عام دیکھنے والوں ہی میں نہیں، بلکہ خود دشمنوں کی صفوں میں بھی بڑھتی چلی جاتی ہے، اور پھر جب فیصلہ کن مقابلوں کا وقت آتا ہے تو قدم قدم پر اُن لوگوں کی ہمدردیاں طرح طرح سے کام آتی ہیں جو دشمنوں کے جبر کی وجہ سے خاموش بیٹھے ہوئے تھے مگر دل سے اِس دعوت کے حامی تھے، یہاں تک کہ آخرکار چند مٹھی بھر ہٹ دھرم دشمن ہی میدان میں رہ جاتے ہیں جن کا ساتھ دینے والا تو درکنار ان کے پیچھے رونے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔

ظلم و جور کا ماحول جہاں بھی ہو اس کے مقابلے میں حق پرستی کا علم بلند کرنے اور بلند رکھنے سے یہ تینوں نتائج لازماً رونما ہوں گے۔ اس لیے یہ تو حق کی کامیابی کا فطری راستہ ہے، آپ اسلامی نظام برپا کرنے کے لیے جمہوری اداروں کی مٹی پلید ہونے اور شہری آزادیاں سلب ہو جانے اور بنیادی حقوق کچل دیے جانے کا رونا خواہ مخواہ روتے ہیں۔ (تصریحات، ص ۳۲۰-۳۲۴)

شُکر گزار بنو!

سید احمد عروج قادریؒ

اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُکۡرًا ؕ وَ قَلِیۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ الشَّکُوۡرُ ۝ (سبا ۳۴:۱۳)

اے آل داوٗد! عمل کرو شکر کے طریقے پر، میرے بندوں میں کم ہی شکر گزار ہیں۔

سورۂ سبا میں حضرت داوٗد و سلیمان علیہما السلام پر اپنی نعمتوں اور احسانات کا ذکر کرنے کے بعد اللہ نے آل داوٗد کو شکر گزاری کے ساتھ عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔ شکر کی مختصر توضیح کے لیے اس آیت کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کہ قرآن میں لفظ 'شُکر' اسی آیت میں استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کے مشتقات اور صیغے تو بیسیوں آیتوں میں آئے ہیں لیکن لفظ شُکر اسی آیت میں ہے۔ دوسرا لفظ 'شکور' (پیش کے ساتھ) سورۃ الفرقان اور سورۃ الدھر میں آیا ہے:

وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا، ہر اس شخص کے لیے جو سبق لینا چاہے، یا شکر گزار ہونا چاہے۔ (الفرقان ۲۵:۶۲)

ہم تمھیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔ (الدھر ۷۶:۹)

'شکر' قرآن کریم کا ایک وسیع المعنی اور وسیع الاطراف لفظ ہے۔ اس تشریح میں میرا مقصد تمام معانی اور تمام اطراف پر سیر حاصل گفتگو کرنا نہیں ہے، بلکہ ذیل کے چند نکات کی مختصر توضیح مقصود ہے: شکر کے معنی، شکر کی ضد، شکر کی قسمیں، اللہ کا شکر، بندوں کا شکر، شکر کی نسبت اللہ کی طرف، شکر کی نسبت بندوں کی طرف، صبر اور شکر کا اجتماع، امتحان شکر، شکر کا دنیوی صلہ۔

شکر کے معنی: ایک معنی یہ ہیں: تصور النعمة واظهارها ، نعمت کا تصور اور اس کا اظہار۔ اس جانور کو جو فربہ ہو دابّة شَكُوْرٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی فربہی سے اپنے مالک کی مہربانی اور اس کے احسان کا اظہار کرتا ہے، یعنی یہ کہ وہ اس کو اچھا کھلاتا پلاتا اور اس کی اچھی دیکھ ریکھ کرتا ہے۔ دوسرا معنی ہے الامتلاء من ذکر المنعم علیه ، محسن کے ذکر سے زبان کا تر ہونا اور دل کا مملو ہونا۔ عین شکری وہ آنکھ جو آنسوؤں سے بھری ہوئی ہو۔ (مفردات راغب)

ان دونوں معنوں کے لحاظ سے اللہ کے شکر کا یہ مفہوم مستنبط ہوتا ہے کہ انسان کو اللہ کی نعمت کا احساس ہو اور وہ اس کا اظہار بھی کرے۔ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (الضحیٰ ۹۳:۱۱) ''اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو''۔ نیز یہ کہ انسان کی زبان اللہ کے ذکر سے تر اور اس کا دل اس کی نعمت کا معترف رہے۔

شکر کی ضد: اس کی ضد کفر ہے، کفرانِ نعمت کے معنی میں: مفردات میں ہے: ویضاده الکفر وهو نسیان لانعمة وسترها، یعنی شکر کی ضد کفر ہے اور یہاں اس کے معنی ہیں نعمت کو بھول جانا اور اس کو چھپانا۔ سورۂ زمر میں ہے:

> اگر تم کفر کرو گے تو اللہ تم سے بے نیاز ہے، لیکن وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا، اور اگر تم شکر کرو تو اسے وہ تمھارے لیے پسند کرتا ہے۔ (۳۹:۷)

اس آیت میں کفر، کفرانِ نعمت اور ناشکری کے معنی میں استعمال ہوا ہے کیونکہ اس کے بعد ہی شکر کا ذکر ہے۔ اس طرح کی متعدد آیتیں قرآن کریم میں ہیں۔

شکر کی قسمیں: شکر کی تین قسمیں ہیں: ۱- زبان کا شکر ۲- دل کا شکر ۳- اعضا و جوارح کا شکر۔ مفردات امام راغب میں ہے: شکر کی تین قسمیں ہیں: دل کا شکر، یہ نعمت کا احساس ہے، اور زبان کا شکر محسن کی مدح و ثنا ہے، اور باقی تمام اعضا کا شکر، یہ نعمت کی مکافات ہے، بقدر استحقاقِ منعم۔ مکافاتِ نعمت کا مطلب یہ ہے کہ محسن کے احسان کا حق ادا کیا جائے۔ جس درجے کا محسن ہوگا، اسی درجے کا حقِ احسان ہوگا۔

اللہ کا شکر: تمام نعمتوں کا حقیقی منعم و محسن اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے اس کا شکر ہر انسان پر واجب ہے۔ اللہ کا سب سے بڑا شکر اس پر ایمان لانا ہے اور یہ وہ شکر ہے کہ اس کے بغیر کوئی شخص

اللہ کے غضب اور اس کی دوزخ سے نجات نہیں پا سکتا۔ شکر کی ضد، کفرانِ نعمت ہے اور سب سے بڑی ناشکری اس پر ایمان نہ لانا ہے۔ یہ ناشکری وہ حقیقی کفر ہے جو انسان کو ابدی لعنت میں گرفتار کر دیتا ہے:

> جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا اور کفر کی حالت ہی میں جان دی، ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ اسی لعنت زدگی کی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کی سزا میں تخفیف ہوگی اور نہ انھیں پھر کوئی مہلت دی جائے گی۔ (البقرہ ۲:۱۶۱-۱۶۲)

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اللہ نے کفار و مشرکین کو اپنی نعمتیں یاد دلائی ہیں اور پھر ان سے سوال کیا ہے: اَفَلَا یَشْکُرُوْنَ (پھر کیا یہ شکر ادا نہیں کرتے؟)۔ سورۂ یٰسٓ میں دو بار یہ سوال کیا ہے (یٰسٓ ۳۶:۳۵، ۷۳)۔ کہیں لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ کا صیغہ ہے۔ کہیں لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ کا۔ کہیں قَلِیْلاً مَّا تَشْکُرُوْنَ، کہیں فَلَوْلَا تَشْکُرُوْنَ اور کہیں وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُوْنَ ـــــ ان تمام مقامات میں جو دعوت ان کو دی گئی ہے وہ دعوت توحید ہے۔ اللہ پر ایمان لانا اور اسی کو الٰہ واحد تسلیم کرنا، یہ ہے اللہ رب العزت کا وہ شکر جس کے بغیر نہ کوئی انسان دائرۂ کفر و شرک سے باہر نکل سکتا اور نہ اللہ کی رحمت و جنت کا مستحق ہو سکتا ہے۔

انبیاے کرام کی دعوت کا ایک جز: انبیاے کرام علیہم السلام نے اپنی قوموں کو توحید اور بندگیِ رب کی جو دعوت دی ہے اس کا ایک جز دعوتِ شکر گزاری بھی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ''اللہ سے رزق مانگو اور اسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو، اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو''۔ (العنکبوت ۲۹:۱۷)

عبادت کا لازمی تقاضا: اللہ کے شکر کو اس کی عبادت کا لازمی تقاضا قرار دیا گیا ہے:

> پس اے لوگو! اللہ نے جو کچھ حلال اور پاک رزق تم کو بخشا ہے اسے کھاؤ اور اللہ کے احسان کا شکر ادا کرو۔ اگر تم واقعی اسی کی بندگی کرنے والے ہو۔ (النحل ۱۶:۱۱۴)

یہی مطالبہ مسلمانوں سے بھی کیا گیا ہے: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم حقیقت میں اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں بخشی ہیں انھیں بے تکلف کھاؤ اور اللہ کا شکر

ادا کرو‘‘۔(البقرہ ۲:۱۷۲)

شکر: حکمت کا اولیں ثمرہ : اللہ نے حضرت لقمان کو حکمت عطا کی اور ساتھ ہی اپنا شکر ادا کرنے کا حکم دیا۔ ’’ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کا شکر گزار ہو۔ جو کوئی شکر کرے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے۔ اور جو کفر کرے تو حقیقت میں اللہ بے نیاز ہے اور آپ سے آپ محمود ہے‘‘۔(لقمان ۳۱:۱۲)

حضرت سلیمانؑ کی توفیق شکر کی دعا: اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جو محیر العقول نعمتیں عطا فرمائی تھیں، ان میں ایک یہ تھی کہ وہ حشرات الارض کی زبان سمجھتے تھے۔ چیونٹیوں کے سردار کی گفتگو سن کر انھوں نے یہ دعا مانگی:

> اے میرے رب! مجھے قابو میں رکھ کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے اور ایسا عمل صالح کروں جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھ کو اپنے صالح بندوں میں داخل کر۔(النمل ۲۷:۱۹)

اللہ کی بے شمار نعمتیں: قرآن کریم نے یہ حقیقت بھی انسانوں کے سامنے رکھ دی ہے کہ اللہ کی نعمتیں اور اس کے احسانات ناقابلِ شمار ہیں: ’’اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو کر نہیں سکتے‘‘(ابراھیم ۱۴:۳۴)۔ ’’اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو گن نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی درگزر کرنے والا اور رحیم ہے‘‘۔(النحل ۱۶:۱۸)

ان آیات میں غفور اور رحیم کی دو صفتیں قابلِ غور ہیں۔ کچھ ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ یہ ناشکروں کی تنبیہ کے لیے بھی ہیں اور شکر گزاروں کی تسکین کے لیے بھی۔ تنبیہ یہ ہے کہ جس مالک کے اپنے بندوں پر اتنے احسانات ہیں کہ وہ ان کا احاطہ نہیں کر سکتے، جن کی زندگیاں گود سے گور تک اس کے احسانات میں ڈھکی ہوئی ہیں اور جس نے ان کے بقا و ارتقا کے تمام سامان مہیا کر رکھے ہیں، کیا ان کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ ایسے مہربان مالک کی بغاوت پر آمادہ ہوں‘ اس کے حقوق میں دوسروں کو شریک کریں اور ناشکری کے رویے پر اڑے رہیں۔ ان کو متنبہ رہنا چاہیے کہ وہ غفور اور رحیم ہے، اس لیے وہ ان کو توبہ و اصلاح کی مہلت دے رہا ہے۔ شکر گزاروں کی تسکین یہ ہے کہ اگرچہ وہ اس کی بے شمار نعمتوں کا شکر یہ ادا نہیں کر سکتے لیکن وہ غفور اور رحیم ہے، اس لیے

ان کی کوتاہیوں سے درگزر کرے گا اور انھیں اپنے دامنِ رحمت میں چھپا لے گا۔

ہر نیکی شکر ہے: پہلے گزر چکا کہ شکر کی تین قسمیں ہیں اور نیکی کا ہر کام اللہ کی نعمت ہے خواہ اس کا تعلّق قلب سے ہو یا زبان سے یا دوسرے اعضا و جوارح سے۔ اس نعمت کا شکریہ اس کو انجام دینا ہی ہے۔ اس لیے تمام عبادتیں، شکر ہیں اور ہر نیکی جو مسلمان خالصتاً اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے، شکر ہے۔ رمضان کے روزوں کو نعمت قرآن کا شکریہ، خود اللہ تعالیٰ نے قرار دیا ہے: وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (اور تاکہ تم شکرگزار بنو)، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمھیں قرآن کی جو عظیم الشان نعمت عطا کی ہے۔ رمضان کے روزے اس کا شکریہ بن جائیں۔ عبدالرحمٰن سلمیٰ نے کہا: ''نماز شکر ہے، روزے شکر ہیں اور ہر نیک کام جو تم اللہ کے لیے کرتے ہو، شکر ہے، اور افضل شکر اللہ کی حمد ہے''۔ (مختصر تفسیر ابن کثیر بحوالہ ابن جریر)

بندوں کا شکر: اللہ تعالیٰ کی بہت سی نعمتیں ایسی ہیں جو بندوں کو دوسرے بندوں کے واسطے اور ذریعے سے ملتی ہیں۔ اس لیے ان واسطوں اور ذریعوں کا بھی علی قدر مراتب (جس کا جو درجہ و مرتبہ ہو) شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بندوں میں سب سے بڑا حق والدین کا ہے۔ کیونکہ ہر انسان کو اس کے وجود اور ہستی کی نعمت، والدین ہی کے واسطے سے ملتی ہے۔ والدین ہی کو یہ خصوصیّت حاصل ہے کہ قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ ان ہی دونوں کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

> اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسانوں کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے، اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اُٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اُس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔ (اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجالا، میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔ (لقمان ۳۱:۱۴)

والدین کے حقوق اور ان کا شکریہ، ایک مستقل موضوع ہے۔ اس لیے اس کی تفصیل ہم یہاں پیش نہیں کرتے اس کے لیے سورۂ لقمان اور سورۂ بنی اسرائیل کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ احادیث نبوی میں بھی اس کی تفصیل موجود ہے۔

بندوں کا شکر ادا کرنے کی اہمیت: ایک انسان جب دوسرے انسان پر کوئی

احسان کرتا ہے تو شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ محسن کا شکریہ ادا کیا جائے۔ دین میں اس کی اہمیت یہ ہے کہ جو شخص انسانوں کا شکر ادا نہیں کرتا، اللہ اس سے اپنے شکریے کو بھی قبول نہیں کرتا۔ امام ترمذی نے ابواب البر والصلۃ میں حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگوں کا شکر گزار نہیں، وہ اللہ کا شکر گزار بھی نہیں۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں: جس نے لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کیا، اس نے اللہ کا شکر ادا نہیں کیا۔

اس باب میں اشعث بن قیس اور نعمان بن بشیرؓ کی حدیث بھی ہے۔ ان حدیثوں سے لوگوں کے شکریے کی اہمیت پوری طرح واضح ہوگئی۔ قرآن کریم میں ایک کلید کے طور پر کہا گیا ہے: هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (الرحمٰن ۵۵:۶۰) ''نیکی کا بدلہ، نیکی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے''۔ جانور بھی اپنے محسن کا احسان مانتے ہیں۔ اب اگر انسان اپنے محسن کا احسان نہ مانے تو وہ جانور سے بھی بدتر ہوا۔

شکریہ ادا کرنے کے طریقے: کسی کے احسان کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ احسان کیا جائے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی کے یہاں ہدیتاً کوئی چیز بھیجے تو جواب میں ہدیتاً اس کے یہاں کوئی چیز بھیجنی چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول فرماتے تھے اور ہدیہ دینے والے کو اس کا صلہ بھی دیا کرتے تھے۔ اگر آدمی احسان کا بدلہ اسی طرح کے احسان سے نہ دے سکے تو زبان سے اپنے محسن کی تعریف کرے اور لوگوں میں اس کے احسان کا تذکرہ کرے۔ اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شکریے کی ایک مختصر دعا بھی سکھائی ہے۔

حضرت اسامہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے ساتھ کوئی نیکی کی جائے اور وہ نیکی کرنے والے سے کہے: جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا ''اللہ تمھیں اس کا اچھا بدلہ دے، اس نے مبالغہ کے ساتھ اپنے محسن کی ثنا کی۔ (جمع الفوائد بحوالہ ترمذی)

دوسری احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے محسن کی مدح و ثنا کو اس کا شکریہ قرار دیا ہے۔ جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا کی مختصر سی دعا کو اگر کوئی سمجھے تو یہ اتنا بڑا بدلہ ہے کہ قیمتی سے قیمتی دنیوی ہدیہ بھی اس کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس دعا کو قبول فرمالے اور اپنی طرف سے اس کا بدلہ دے تو اس کی قیمت کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔

شکر کی نسبت اللہ کی طرف: شاکر اور شکور، اللہ تعالیٰ کی صفت بھی ہے۔ شکر کی نسبت جب اللہ کی طرف ہوتی ہے تو اس کا مطلب 'قدردانی اور ثواب رسانی' ہوتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ فرماں برداری اور نیک کام کی قدر کرتا اور اس کا انمول صلہ دیتا ہے۔ سورۃ البقرہ میں ہے:

> یقیناً صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ لہٰذا جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے، اس کے لیے کوئی گناہ کی بات نہیں کہ وہ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان سعی کر لے اور جو برضا و رغبت کوئی بھلائی کا کام کرے گا، اللہ کو اس کا علم ہے اور وہ اس کی قدر کرنے والا ہے۔ (۲:۱۵۸)

سورۂ نساء میں انسان کے شکر اور اللہ کے شکر کو ایک ہی جگہ بیان کیا گیا ہے:

> آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمھیں خواہ مخواہ سزا دے اگر تم شکرگزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو۔ اللہ بڑا قدردان ہے اور سب کے حال سے واقف ہے۔ (۴:۱۴۷)

اللہ کے لیے شکور کا لفظ بھی متعدد مقامات پر آیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

> اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ o (فاطر ۳۵:۳۴) یقیناً ہمارا رب معاف کرنے والا اور قدر فرمانے والا ہے۔

شکر کی نسبت بندوں کی طرف: بندوں کو شاکر اور شکور کہنے کا مطلب 'اعترافِ نعمت اور احسان مندی' ہوتا ہے یعنی بندہ اپنے مالک کی نعمتوں اور اس کے احسانات کا معترف اور جذبۂ شکر و سپاس سے سرشار رہے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

> واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم اپنی ذات سے ایک پوری اُمت تھا، اللہ کا مطیع فرمان اور یک سو۔ وہ کبھی مشرک نہ تھا۔ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا تھا۔ اللہ نے اس کو منتخب کر لیا اور سیدھا راستہ دکھایا۔ (النحل ۱۶:۱۲۰-۱۲۱)

حضرت نوحؑ کے بارے میں فرمایا: ''اور نوح ایک شکرگزار بندہ تھا''۔ (بنی اسرائیل ۱۷:۳)

بیک وقت صبر و شکر کا اجتماع: صبر کا تعلق عام طور پر بلا و مصیبت سے ہوتا ہے

اور شکر کا عافیت و آرام سے۔ لیکن ایک چیز دو مختلف اعتبارات سے بیک وقت مصیبت بھی ہوتی ہے اور نعمت بھی۔ ایک مومن و مسلم پر اللہ کی طرف سے جو مصیبت آتی ہے، وہ دنیا کے لحاظ سے مصیبت ہوتی ہے اور اجرِ آخرت کے اعتبار سے نعمت ___ ایسے موقع پر صبر اور شکر کا اجتماع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ کے بعض ایسے بندے بھی ہوتے ہیں جو غلبۂ محبت الٰہی میں مصیبت سے لذت حاصل کرنے لگتے ہیں۔ اسی کیفیت کے اظہار کے لیے کہا گیا ہے: ع ہر چہ از دوست می رسد نیکو است، یعنی دوست [اللہ] کی طرف سے جو چیز بھی پہنچے، وہ اچھی ہے۔ قرآن کریم میں صبّار اور شکور کا اجتماع شاید اسی کی طرف اشارہ ہے:

> اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ ○ (ابراھیم ۱۴:۵) ان واقعات میں بڑی نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔

یہ بات ایک حدیث میں صراحت کے ساتھ کہی گئی ہے۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں، ابویعلیٰ نے اپنی مسند میں اور حاکم نے اپنی مستدرک میں ابوسعید خدریؓ سے مرفوعاً یہ روایت کی ہے کہ سخت ترین مصیبتیں انبیاؑ پر آتی ہیں۔ اس کے بعد اللہ کے نیک بندوں (صالحین) پر۔ اس حدیث کا یہ ٹکڑا قابلِ غور ہے۔

> تم میں کوئی فرد عطاء و نعمت سے جتنا خوش ہوتا ہے، ان میں کا ایک فرد اس سے زیادہ بلا و مصیبت سے خوش ہوتا تھا۔ (مسند امام اعظم مع شرح ملا علی قاری)

بلا و مصیبت انبیاے کرام علیہم السلام کے لیے رفع درجات کا موجب اور اولیا کے لیے کفارۂ سیئات کا وسیلہ ہے۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم باب الشکر میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے:

> ہر مصیبت جو مجھ پر آئی اللہ تعالیٰ کے چار انعامات اپنے ساتھ لائی۔ ایک یہ کہ اس کا تعلّق میری دنیا سے تھا، دین سے نہ تھا، دوسرا یہ کہ اس مصیبت سے کوئی بڑی مصیبت بھی آسکتی تھی مگر اللہ کے کرم سے چھوٹی آئی۔ تیسرا یہ کہ میں قضا و قدر پر راضی رہا، اور چوتھا یہ کہ میں اس پر اجر و ثواب کا امیدوار ہوں۔

امتحانِ شکر: شکر کی آزمایش، صبر کی آزمایش سے زیادہ کٹھن ہوتی ہے۔ اس تشریح

کی ابتدا میں سورۂ سبا کی جو آیت پیش کی گئی ہے اس کا دوسرا فقرہ یہ ہے: وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ○ (۳۴:۱۳) ''اور میرے بندوں میں کم ہی شکر گزار ہیں''۔

اس فقرے کے بارے میں امام راغب نے لکھا ہے: اس میں تنبیہ ہے اس بات کی کہ شکر الٰہی کا پورا حق ادا کرنا بہت مشکل ہے، اس لیے قرآن میں صرف دو نبیوں کو اس صفت سے متصف قرار دے کر اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح کی ہے، یعنی حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام۔

حضرت نوحؑ کو سورۂ بنی اسرائیل میں عَبْدًا شَكُوْرًا (شکر گزار بندہ) اور حضرت ابراہیمؑ کو سورۂ نحل میں شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ (اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار) کہا گیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسرے انبیاے کرام کی شکر گزاری کم تھی، بلکہ اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ ان دونوں نبیوں کی اس صفت کا ذکر کر کے انھیں ایک 'امتیاز' عطا کیا گیا ہے۔ قومِ لوطؑ پر جب عذاب آیا تو اللہ نے آلِ لوطؑ کو عذاب سے بچا لیا۔ اس کو اللہ نے اپنا فضل قرار دیا اور اس کے بعد کہا:

كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ○ (القمر ۵۴:۳۵) یہ جزا دیتے ہیں ہم ہر اُس شخص کو جو شکر گزار ہوتا ہے۔

اس فقرے کی تشریح میں مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے: ''كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ میں حضرت لوطؑ کی غیر معمولی صفت شکر کی غیر معمولی داد بھی ہے اور اس کا اعلانِ عام بھی کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عنایت صرف حضرت لوطؑ ہی کے لیے خاص نہ تھی بلکہ آج بھی جو لوگ اس کے شکر کرنے والے ہوں گے، وہ اس کی عنایتِ خاص کے حق دار ہوں گے۔ اس کا دامن رحمت بہت وسیع ہے''۔ (تدبر قرآن، ج ۷، ص ۱۰۸)

شکر کا دنیوی صلہ: اللہ تعالیٰ آخرت میں اپنے شکر گزار بندوں کو جو اجر عطا فرمائے گا اور جن انعامات سے نوازے گا، وہ تو اپنی جگہ ہیں، دنیا میں اس کا صلہ یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں کا حقیقی شکریہ ادا کرنے سے اس کی نعمتوں اور افضال و عنایات میں اضافہ ہوتا ہے۔ نعمتوں کا حقیقی شکر یہ ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی مرضیات میں صرف کیا جائے، اس کی معصیتوں اور نافرمانیوں میں صرف نہ کیا جائے۔ سورۂ ابراہیم میں ہے:

اور یاد رکھو، تمھارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر شکر گزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ

نوازوں گا اور کفرانِ نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے۔ اور موسٰیؑ نے کہا کہ ''اگر تم کفر کرو اور زمین کے سارے رہنے والے بھی کافر ہو جائیں تو اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے''۔ (۱۴:۷-۸)

شکرگزاری پر انعامات میں اضافے کا یہ وعدہ قیامت تک تمام شکرگزاروں کے لیے ہے، اور ناشکری پر سخت عذاب کی یہ دھمکی بھی قیامت تک تمام ناشکر گزاروں کے لیے ہے۔

اللہ کی سب سے بڑی نعمت اس کی دی ہوئی شریعت ہے۔ اس کا شکر یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے، اس کی حفاظت کی جائے، اور اس کے نفاذ کی جان توڑ کر کوشش کی جائے۔ اس وقت دنیا میں پھیلا ہوا گھنگور اندھیرا اس کے بغیر چھٹ نہیں سکتا:

گھنگور اندھیرا چھایا ہے　　یہ دھندلی شمعیں تیز کرو
منزل ہے کٹھن اور دُور بھی ہے　　گھوڑوں کو ذرا مہمیز کرو

کامیاب زندگی: چند عملی پہلو

ایمان بنت جوہری/ ترجمہ: ریاض محمود انجم

ہماری زندگیوں میں ایک ایسا موڑ، ایسا مرحلہ اور ایک ایسا لمحہ بھی آتا ہے جو ہمیں ماضی کی یاد دلا دیتا ہے۔ ایک ناگوار اور اذیت بھری صورت حال جو ہم پر اس خاص لمحے کی بدولت واقع ہوئی ہو، یا پھر ایسا کوئی غیر معمولی لفظ، اپنی وحشت ناکی کے سبب ہمارے ذہن سے چپک کر رہ گیا ہو، یا پھر کوئی ایسا دل خراش واقعہ جس کا ہم نے اپنی جاگتی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہو۔ ہم واضح طور پر محسوس کرتے ہیں کہ وقت تیزی سے ہمارے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا ہے اور ہم کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں سے کیا فائدہ اٹھایا اور مجموعی طور پر ہمارا حاصل کیا ہے؟ ہم نے اپنی زندگیوں کو کس نہج پر ڈھالا ہے؟

ذرا سوچیے!

ہم کبھی اوجِ کمال پہ تھے لیکن اب وہ سوتے خشک اور بنجر پڑے ہیں جہاں سے علم و عرفان کے چشمے اُبلتے تھے، ہماری خوابیدہ اور پوشیدہ صلاحیتیں کہیں دفن ہو چکی ہیں۔ اب ہمارا مقصدِ حیات صرف اور صرف اِسی عارضی دنیا کی نمود و نمایش کا حصول ہے۔ ہمارے اذہان میں اُس وقت کی یاد بھی سر اٹھا رہی ہے جب ہم خالقِ کائنات کے سچّے اور فائز المرام خادم اور غلام تھے اور اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ ہم تفکر، پریشانی اور ندامت کے عمیق گڑھے میں گرے روحانی طور پر کمزور سے کمزور تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ہم لاعلم ہیں بلکہ ہم یہ بخوبی جانتے ہیں کہ ہم نے اپنے مقصد، اپنے ہدف کی جانب پیش رفت نہیں کی ہے۔

ہم اپنی اصلاح کے خواہاں ہیں ــــــ اور ہمیں بخوبی علم ہے کہ ہم میں یہ صلاحیت موجود ہے۔ آئیے، ہم ذاتی اصلاح کا آغاز دوبارہ کریں۔ آئیے، ہم اپنے منتشر خیالات و احساسات کو مجتمع کریں اور اپنے عہد پر عمل پیرا ہونے کا عزمِ صمیم کریں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اب کی بار نہ تو ہم اسلامی تعلیمات کو فراموش کریں گے اور نہ اپنے ارادوں میں ناکام ہی ہوں گے۔ ہم زیادہ سے زیادہ روزے رکھیں گے، نماز کے قیام میں مزید پابندی لائیں گے، تلاوتِ قرآن پاک کا معمول زیادہ کریں گے ــــــ ہم دنیا کو بدل دیں گے اور اسے ایک بہتر مقام بنا دیں گے۔

ہم اس کام کی ابتدا تو اعلیٰ عزم اور انتہائی جوش و خروش کے ساتھ کرتے ہیں لیکن جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے، ہمارے عزائم و ارادے متزلزل ہوتے چلے جاتے ہیں اور بالآخر وقت کی دبیز تہوں میں معدوم ہو جاتے ہیں، ہم اپنے اہداف و مقاصد کو طاقِ نسیان پر رکھ دیتے ہیں۔ ہم ایک بار پھر ارادوں، وعدوں اور اصلاح احوال کے حسین تصور میں کھو جاتے ہیں، حتیٰ کہ ہم دوبارہ اپنا جائزہ لیتے نظر آتے ہیں۔

ہم اس غفلت سے کیسے نجات پا سکتے ہیں؟ ہم اپنے نیک ارادوں کو مستقل عملی شکل کیسے دے سکتے ہیں؟ ــــــ میں یہ نہیں کہتی کہ ان تمام استفسارات کے جواب میرے پاس موجود ہیں۔ تاہم، اپنے ان تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اپنی روزمرہ زندگی کو اسلامی تعلیمات و عقائد و اخلاقیات کے مطابق ڈھالنے کے لیے چند رہنما نکات پیش ہیں:

اپنے ارادوں میں اخلاص پیدا کیجیے

ہمارا ہر فعل، ہر عمل اور ہر لفظ، صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہونا چاہیے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

> کہو، میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سرِ اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔ (الانعام ۶:۱۶۲-۱۶۳)

اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمان ہے:

یہ کتاب ہم نے تمھاری طرف برحق نازل کی ہے، لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو دِین کو اُسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔ خبردار، دین خالص اللہ کا حق ہے۔ (الزمر ۳۹:۲-۳)

ابن القیمؒ نے فرمایا:

نیک نیتی اور اخلاص کے بغیر افعال و اعمال ایسے ہی ہیں جیسے ایک مسافر کے پاس پانی والے برتن میں مٹی ہی مٹی ہو۔ یہ وزن اس کے لیے سراسر بوجھ ہے اور اسے اس سے قطعی کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

دعا کے ذریعے نصرت الٰہی طلب کیجیے

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو آگاہ کیا ہے کہ وہ اپنے بندے کے دل سے نکلنے والی ہر دعا اور عرض کو سنتا ہے اور پکارنے والے کو اس کا جواب بھی دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔ (البقرہ ۲:۱۸۶)

بلاشبہہ جب ہم تفکرات و پریشانیوں میں گِھر جاتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے جو ہماری خبرگیری کی قدرت رکھتی ہے۔ اس ضمن میں فرمانِ الٰہی ہے:

کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے، جب کہ وہ اسے پکارے اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے؟ (النمل ۲۷:۶۲)

تساہل سے اجتناب کیجیے

ہم میں سے کسی شخص کے لیے اپنے مقاصد و اہداف کے حصول کو آج ہی سرانجام دینے کے بجائے کل پر ٹال دینا نہایت ہی آسان ہے، کیونکہ اس طور ہم اپنی نااہلی اور بے قاعدگی کو منطق کی دبیز تہہ میں دفن کرسکتے ہیں۔ ہماری زبان پر اکثر یہی کلمات ہوتے ہیں: ''ان شاء اللہ میں کل اپنی زندگی میں تبدیلی لاؤں گی''، لیکن یہ 'کل' کبھی نہیں آتی اور آپ کا یہ ارادہ بھی کبھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتا۔ قرونِ وسطیٰ کے کسی عالم نے کہا تھا:

اپنی تساہل پسندی آج کا کام کل پر ٹالنے کے خطرناک اصول کو اپنے قریب بھی نہ

پھٹکنے دیجیے۔ یہ شیطان کی فوج کا سب سے طاقت ور سپاہی ہے۔ وہ بات نہ کیجیے، وہ ارادہ نہ باندھیے جس کے لیے آپ دلی طور پر تیار نہیں ہیں۔ اس عمل کے باعث آپ کسی اور کو نہیں، بلکہ خود کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ اپنے ارادوں اور اپنے عزم کو ذوق وشوق اور مثبت اندازِ فکر عطا کیجیے۔

ارادہ باندھیے اور حقیقی مقاصد کو سامنے رکھیے

عام طور پر ہم ابتدا ہی سے بڑے بڑے منصوبوں کے خواب دیکھنے لگتے ہیں لیکن جب یہ عملی طور پر تکمیلی شکل اختیار نہیں کرتے تو ہم حوصلہ ہار دیتے ہیں۔ ہم مایوس ہوجاتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ کوئی بھی معمولی یا ادنیٰ کام چھوٹا نہیں ہوتا۔ ایک دن نبی کریمؐ سے کسی نے پوچھا کہ کون سا کام اللہ تعالیٰ کو بہت مرغوب ہے، تو آپؐ نے فرمایا: ''وہ کام جو باقاعدگی اور تسلسل سے کیا جائے، اگرچہ وہ چھوٹا سا ہی کیوں نہ ہو''۔ (بخاری، فتح الباری)

بڑے بڑے، بے فائدہ اور اندھادھند ڈگ بھرنے کے بجاے، چھوٹے چھوٹے مفید اور مسلسل قدم، عظیم کامیابیوں کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں محاورتاً ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نوالہ اتنا لیں جتنا چبا سکیں اور نگل سکیں۔ ہمیشہ ابتدا چھوٹے چھوٹے کاموں سے کیجیے۔ چھوٹے چھوٹے منصوبے بنائیے تاکہ آپ اپنے ارادوں کو مستقل اور آسانی کے ساتھ جاری رکھ سکیں اور پھر اس کے بعد ذرا مشکل کام میں ہاتھ ڈالیں۔ یہ لائحہ عمل آپ کے لیے حوصلہ افزائی کا باعث ہوگا، اور آپ مزید کامیابی سے ہم کنار ہوسکیں گے۔ ان شاء اللہ وقت گزرنے کے ساتھ آپ محسوس کریں گے کہ آپ کی زندگی، آپ کے معمولات میں عظیم انقلاب رونما ہوچکا ہے۔

مفید حلقۂ احباب بنائیے

ابن حزم نے فرمایا:

جو فرد آپ پر تنقید کرتا ہے وہی آپ کا دوست ہے، اور جو آپ کی غلطیوں کو اُچھالتا ہے اسے آپ سے قطعی محبت و ہمدردی نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ نصیحت ان کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے جو اسے اپنی گرہ سے باندھ لیتے

ہیں، لہٰذا ان افراد کو اپنا دوست بنایئے جو اچھے ساتھی ثابت ہوں۔ اچھے ساتھی ہی آپ کو صحیح مشورہ دیں گے اور یہ سچے دوست ہی آپ کے ارادوں کی تکمیل میں آپ کے مددگار ثابت ہوں گے۔ ان افراد کی صحبت سے پرہیز کیجیے جو آپ کے عزم کو متزلزل کرنے کی یا آپ کے پائے استقلال میں لرزش لانے کی کوشش کریں۔ حضرت علیؓ کے اس فرمان کو ہمیشہ مدنظر رکھیے:

> ہمیشہ نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرو، تم ان جیسے ہی ہو جاؤ گے، اور بُرے لوگوں کی صحبت سے بچو تاکہ تم ان کے شر سے محفوظ رہ سکو۔

ترقی کی رفتار پر نظر رکھیے

اپنے اہداف و مقاصد کی ایک فہرست بنالیں اور اسے اپنے سامنے دیوار پر لٹکا دیں۔ اس فہرست کو اپنی ڈائری میں بھی لکھ لیجیے۔ اسے اپنے بٹوے میں بھی رکھیں اور یا پھر اسے اپنے لاکر کے اندر چسپاں کردیں۔ پھر آپ یہ بھی کرسکتے ہیں کہ اپنے اہداف و مقاصد کی تکمیل کے لیے کیے جانے والے کاموں کو ترتیب وار اپنی نوٹ بک میں تحریر کرتے جائیں، حتیٰ کہ آپ کمپیوٹر پر بھی اپنے نام سے بنائی گئی فولڈر/ فائل پر ان اقدامات کو درج کرسکتے ہیں۔ اپنے آپ کے ساتھ مخلص رہیے کہ اپنے اہداف و مقاصد پر تنقیدی نظر ڈالتے رہیے۔ اس عمل کے ذریعے آپ سُست نہیں ہوں گے۔ مسلم میں بیان کردہ ایک حدیث کے مطابق جب نبی کریمؐ کسی کام کا آغاز کرتے تو اسے ختم کردیتے۔ حدیث قدسی ہے:

> میرے بندے میری قربت اور وصل حاصل کرنے کے لیے اس وقت تک خفیہ طور پر نوافل ادا کرتے رہتے ہیں، جب تک میں ان کی طرف متوجہ نہیں ہوجاتا۔ (بخاری)

مَایَازَلُو یہ خاص لفظی اصطلاح، وصلِ الٰہی کے حصول و جستجو کی سعی کے لیے تسلسل اور تواتر کا اشارہ ہے۔ حضور نبی کریمؐ نے بھی فرمایا: ''حج اور عمرہ بار بار کرتے رہو''۔

ضعفِ ایمان میں مبتلا نہ ہوں

یہ ایک ناگزیر حقیقت ہے کہ بعض اوقات ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہمارا ایمان متزلزل ہو رہا ہے، یا ہم میں جہدِ مسلسل کی اُمنگ اور جوش و جذبہ ماند پڑ رہا ہے۔ اس ضمن میں

رسول اللہؐ کا فرمان ہے:

جس طرح جسم پر لباس پہنتے پہنتے پتلا اور بوسیدہ ہو جاتا ہے، اسی طرح دل میں بھی ایمان کا ضعف پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اللہ سے دعا مانگو کہ وہ تمھارے دل میں ایمان تازہ کر دے۔(الحاکم)

عبادتِ الٰہی اور نیک افعال سرانجام دینے کا مطلب یہ نہیں کہ بندہ کسی اور طرف توجہ نہ کرے۔ ان افعال کا تسلسل تو ہمارے فرائض میں شامل ہے۔ جب ہم میں قوت اور آمادگی اور خواہش موجود ہوتی ہے تو ہم جان توڑ کوشش کرتے ہیں، اور جب ہم ان قوتوں سے محروم ہوتے ہیں، تو جو کچھ ہمارے بس میں ہوتا ہے، وہ کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

دین میں بہت آسانی ہے اور جو دین میں اپنے لیے غیر معمولی مشکلات پاتا ہے، وہ دین کے مطابق نہیں چل سکتا۔ لہٰذا تمھیں دین کے معاملے میں انتہا پسندی سے بچنا چاہیے، بلکہ صحیح ترین چیز اپنانا چاہیے۔(بخاری)

ایک دوسری حدیث کے مطابق رسول اللہؐ نے فرمایا: ''اپنے اعمال وافعال میں اعتدال پیدا کرو، پھر تم اپنا مقصد حاصل کرسکو گے''۔(بخاری)

اپنے جذبے کو تحریک دیجیے

بہتر زندگی گزارنے کے لیے اپنے جذبے کو تحریک دیجیے۔ اس کے بہترین ذرائع قرآن عظیم، نبی کریمؐ، آپؐ کے صحابہ کرامؓ، آپؐ کے متقی جانشین اور علماے کرام ہیں۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی زندگی پر نظر دوڑایئے۔ اپنی عمر کے آخری حصے میں ان کی عبادت کے معمول میں بہت شدت پیدا ہو چکی تھی۔ کسی نے ان سے کہا کہ وہ عبادتِ الٰہی میں کمی کیوں نہیں کرتے اور خود کو آرام کیوں نہیں پہنچاتے؟ آپ نے جواب دیا: ''جب گھڑ دوڑ شروع ہوتی ہے تو اختتامی نقطے کے قریب پہنچ کر گھوڑے اپنی تمام تر توانائی صرف کر ڈالتے ہیں، اور میری زندگی میں جو کچھ بھی باقی بچا ہے، وہ اس سے کہیں کم ہے''۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی وفات تک اسی تندہی سے عبادتِ الٰہی میں مصروف رہے۔

عامر بن عبداللہ کی زندگی کو بھی پیش نظر رکھیے۔ ایک دفعہ آپ سے کسی نے پوچھا: آپ ساری ساری رات کیسے جاگ لیتے ہیں اور شدید گرمی و تپش میں پیاس کیسے برداشت کرتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا: کیا اس سے بھی بہتر کوئی چیز ہے کہ صبح کا کھانا رات تک ملتوی کر دیا جائے، اور رات کی نیند دن پر قربان کر دی جائے۔ جب رات آتی تو وہ کہتے: ''دوزخ میں دہکتی آگ کا تصور مجھے سونے نہیں دیتا'' اور وہ پھر صبح تک جاگتے رہتے۔

پھر الرابی ابن خزائم کی زندگی کی تصویر ملاحظہ کیجیے۔ ابوحیان نے بتایا کہ ان کے والد نے کہا: الرابی ابن خزائم ٹانگوں سے معذور تھے اور باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے ان کو اٹھا کر لے جایا جاتا تھا۔ بعض لوگوں نے ان سے کہا: آپ کی معذوری کے سبب آپ کو تو مسجد میں نماز کے لیے آنے کی چھوٹ ہے۔ آپ نے جواب میں ایک حدیث سے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: ''نماز کے لیے بلاوے کی آواز حی علی الصلٰوۃ میرے کانوں میں سنائی دیتی ہے، لہٰذا تمھیں اگر نماز کے لیے رینگتے ہوئے بھی جانا پڑے تو اسی طرح جاؤ''۔

عبادت کے لیے مختلف طریقے اپنائیے

اللہ تعالیٰ نے اُمت مسلمہ پر بے انتہا لطف و کرم کرتے ہوئے مسلمانوں کو عبادت کے متعدد طریقے مرحمت فرمائے ہیں۔ ان میں سے کچھ جسمانی حرکات و سکنات پر مشتمل ہیں، مثلاً نماز، کچھ مالی ہیں، مثلاً زکوٰۃ و صدقہ، کچھ الفاظ پر مشتمل ہیں، مثلاً دعا اور ذکر۔

ان مختلف آسان طریقوں میں پوشیدہ حکمت، مختلف افراد کی آمادگی اور صلاحیتوں کی نوعیت میں امتیاز کو ظاہر کرتی ہے۔ بعض لوگ دیگر افراد کی بہ نسبت عبادت الٰہی کا فرض کی حیثیت سے زیادہ اہتمام کرتے ہیں جس میں عذر کی گنجایش نہیں۔ اسی طرح بعض کا رجحان راہِ خدا میں مال خرچ کرنے اور انفاق کی طرف زیادہ ہوتا ہے، اور بعض کا ذکر اذکار میں۔ اس میں شک کی گنجایش نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عبادت کی مختلف اقسام کے مطابق جنت کے مختلف دروازے متقیوں کے لیے وا کر دیے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی بیان کردہ ایک حدیث مبارکہ کے مطابق حضور نبی کریمؐ نے فرمایا: جو شخص رضاے الٰہی سے منسلک کام، اللہ کی رضا کی خاطر سرانجام دے گا، وہ جنت کے

دروازوں (مسلکہ دروازوں) میں سے بلایا جائے گا۔ اے اللہ کے بندے، یہ تو انعامِ خداوندی ہے، تم میں سے جو شخص نمازی ہوگا، اسے جنت میں نماز کے دروازے سے پکارا جائے گا۔ تم میں سے جو شخص جہاد کرتا ہوگا، اسے جنت میں جہاد کے دروازے سے پکارا جائے گا۔ تم میں سے جو شخص روزے کا پابند ہوگا، اسے جنت میں الریان کے دروازے سے پکارا جائے گا۔ تم میں سے جو شخص خیرات وصدقہ کرتا ہوگا، اسے جنت میں خیرات وصدقہ کے دروازے سے پکارا جائے گا۔ (بخاری)

ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیجیے

جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے، متعدد اقسام کے کام اور افعال سرانجام دیے جاسکتے ہیں۔ روزمرہ کے معمولات میں گھریلو، دفتری، کاروباری، خاندانی اور دوستی کے امور شامل ہیں جنھیں نہایت ذمہ داری کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خیال رہے کہ دنیاوی امور میں مگن ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنے روزمرہ معمولات میں اسلامی تعلیمات، عقائد اور اخلاقیات کو داخل کرنا بھول جائیں اور اپنی زندگی کو احکامِ الٰہیہ اور سنتِ رسولؐ کے مطابق ڈھالنے سے گریز کریں۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے، اللہ تعالیٰ نے عبادت کے نہایت آسان طریقے مرحمت فرمائے ہیں۔ کھانا پکاتے ہوئے ذکر کیا جاسکتا ہے، بس کا انتظار کرتے ہوئے دعا کے الفاظ دہرائے جاسکتے ہیں، دفتر سے گھر آتے ہوئے گاڑی میں اسلامی تعلیمات و احکامات پر مبنی لیکچر سنا جاسکتا ہے، آسان عبادات کی فہرست نہایت ہی طویل ہے۔ بہرحال، حاصل کیا ہے، حاصل یہ ہے کہ آپ جو کچھ جب بھی کرسکتے ہیں، کریں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ثابت قدمی اور استقلال عطا فرمائے اور ہمیں دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں سرخ رو فرمائے۔ آمین! (ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ (WAMY) کا ترجمان، *Muslim Youth*، ریاض، مارچ ۲۰۰۶ء)

نظریۂ ضرورت: قانون اور انصاف کا خون

جسٹس سردار محمد رضا/ ترجمہ: مسلم سجاد

'نظریۂ ضرورت' کے سہارے پاکستان کے دستوری اور سیاسی نظام کا حلیہ بگاڑ دیا گیا ہے اور ہر طالع آزما کی زور آوری اور دستور شکنی کو اس کے ذریعے جواز فراہم کیا گیا ہے جو ہماری ۶۰ سالہ تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ ۲۰۰۷ء میں سپریم کورٹ نے اس بدنامِ زمانہ 'نظریۂ ضرورت' کے شکنجے سے قوم کو نجات دلانے کی جرأت مندانہ کوشش کی اور عدالت نے صاف الفاظ میں اپنے اس عندیے کا اظہار کیا کہ اب نظریۂ ضرورت کو ہمیشہ کے لیے دفن ہو جانا چاہیے، لیکن ایک بار پھر اس منحوس نظریے کا سہارا لے کر ۳ نومبر ۲۰۰۷ء کو فوج کے اس وقت کے سربراہ نے دستور کے ساتھ عدالت عالیہ ہی پر ضرب کاری لگائی اور تاریخ کے دھارے کو ایک بار پھر پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔ من پسند عدلیہ جو بھی کہے لیکن اب قوم بیدار ہے، اور حقیقی عدلیہ اور سول سوسائٹی بشمول پریس اور سیاسی جمہوری قوتوں کے اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے کمربستہ ہیں۔ آج قوم ایک تاریخی جدوجہد میں مصروف ہے۔ سپریم کورٹ کے ۲۸ ستمبر ۲۰۰۷ء کے فیصلے میں (جو امیر جماعت اسلامی پاکستان قاضی حسین احمد، جماعت اسلامی اور چیئرمین تحریکِ انصاف عمران خان وغیرہ کی طرف سے دائر کردہ مقدمے کے بارے میں تھا) اگرچہ چھے محترم ججوں نے تکنیکی بنیاد پر مقدمہ خارج کر دیا، مگر تین محترم ججوں نے مقدمے میں اٹھائے جانے والے سوالات کو درست قرار دیتے ہوئے نہ صرف اسے قابلِ سماعت قرار دیا، بلکہ ان ایشوز پر اپنی راے بھی دی، جس کا حاصل یہ تھا کہ اس وقت کا فوجی سربراہ صدارت کے انتخاب میں شرکت کا حق نہیں رکھتا اور نظریۂ ضرورت کے تحت دستور کے واضح احکام کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اکثریت کی راے سے اختلاف کرنے والے ججوں میں محترم جسٹس سردار محمد رضا نے بڑے اختصار کے ساتھ لیکن بڑے محکم انداز میں نظریۂ ضرورت پر بحث کی ہے جو اب ہماری تاریخ کا حصہ اور قوم کی امانت ہے۔ ہم محترم جسٹس سردار محمد رضا صاحب کے اسی فیصلے کا ترجمہ ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔ (مدیر)

میں نے اپنے فاضل بھائی جسٹس رانا بھگوان داس کا دیا ہوا فیصلہ پڑھ لیا ہے۔ یہ ۲۸ ستمبر

۲۰۰۷ء کے مختصر فیصلے کے دلائل تھے جس میں ہم نے اکثریتی فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے یہ قرار دیا تھا کہ درخواستیں دستور کی دفعہ ۱۸۴ (۳) کے تحت قابلِ سماعت (maintainable) ہیں۔ اس لیے کُل کی کُل قبول کی جاتی ہیں۔ درج بالا فیصلے کے استدلال سے میں اتفاق کرتا ہوں لیکن چاہوں گا کہ عدالت کے فاضل مشیر مسٹر حفیظ پیرزادہ کے موقف پر کچھ تفصیل سے عرض کروں۔

انھوں نے مقدمے کے میرٹ کے خلاف کوئی بات نہیں کی۔ حاجی سیف اللہ کیس (پی ایل ڈی ۱۹۶۸ء ایس سی ۱۶۶) پر ان کے انحصار کرنے کے معنی یہ تھے کہ اگر درخواست دہندگان میرٹ پر اچھا مقدمہ رکھتے ہیں تب بھی ان کے حق میں رٹ جاری کرنا حالات کے لحاظ سے مناسب نہ ہوگا، اس لیے کہ یہ فوجی حکومت سے خالص جمہوریت کی طرف منتقلی میں رکاوٹ ڈالے گا۔ اس طرح کا موقف اختیار کرنا اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ اس بات کو بالکل فراموش کر کے کہ ماضی میں یہ طرزِفکر کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ کرسکا، ایک بار پھر ریاست کی ضرورت کے نظریے کی اہمیّت کو تسلیم کیا جائے۔ اس طرح کا انتقال ایک نئی فوجی حکومت کے لیے ایک حیات افروز وقفہ فراہم کرتا ہے اور قوم کو بار بار زیرو پوائنٹ پر لے آتا ہے ـــــ نظریۂ ضرورت کا عجوبہ!

نظریۂ ضرورت نہ قانون ہے نہ کوئی ضابطہ اور نہ کوئی قاعدہ۔ یہ ایک ایسی حالت ہے جس میں دیے ہوئے حالات میں ایک ناانصافی کو مصلحت کے نام پر جواز فراہم کیا جاتا ہے۔ مغرب کے بہت سے فلسفی، اسکالر اور نام نہاد دانش ور وقتاً فوقتاً مختلف نظریات پیش کرتے رہتے ہیں جن پر پوری دنیا میں مباحثے ہوتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں حقیقی چیزیں اختیار کرلی جاتی ہیں اور آگے بڑھائی جاتی ہیں، جب کہ پس ماندہ اقوام کو غیرحقیقی اوہام کا فریب دیا جاتا ہے جن کی بدقسمتی سے مقدس احکامات کی طرح پیروی کی جاتی ہے۔ دوسری قسم میں ہینس کیلسن کا نظریۂ ضرورت اور میکاولی کا پرنس شامل ہے جو پاکستان جیسے پس ماندہ ملک میں تباہ کن حد تک منافقانہ ہونے کے باوجود بہت پسند کیے جاتے ہیں۔ یہ نظریات نہ عام طور پر دنیا بھر میں قبول کیے جاتے ہیں نہ وہ جدید قانون کی بنیاد ہیں۔ چیف جسٹس حمود الرحمٰن (جیسے کہ وہ اس وقت تھے) کے الفاظ مستعار لیتے ہوئے جنھوں نے چیف جسٹس محمد منیر پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ''انھوں نے نہ صرف ہینس کیلسن کے نظریے کا غلط اطلاق کیا، بلکہ انھوں نے یہ بھی غلط کہا کہ یہ جدید قانون کا عام طور پر تسلیم شدہ

نظریہ ہے۔ کیلسن کے شاگرد بھی وہاں تک جاتے ہوئے ہچکچائے جہاں تک کیلسن گیا تھا......''۔

میرے ذہن کو جو چیز پریشان کرتی ہے وہ کیلسن یا میکاولی کے غیرمعمولی خیالات ہیں، ان کا حقیقی ہونا، یا نہ ہونا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں تو یہ خیالات ختم ہوچکے ہیں لیکن تیسری دنیا میں یہ پھل پھول رہے ہیں۔ اب ہم لوگ بحیثیت مسلمان کیوں ان کی پیروی کریں، کیوں نہ ہم انھیں مسترد کردیں۔ میرا ایمان ہے کہ ہم مسلمانوں کو اپنی آخری رہنمائی وحی کے علم، یعنی قرآن کی دانش سے حاصل کرنا چاہیے۔

ایک ایسی کتاب جو تمام زمانوں پر محیط ہے، اسے جزوی امور سے احتراز کرنا چاہیے اور اصولوں کو بیان کرنا چاہیے۔ یہ بات قرآن کے لیے بدیہی طور پر سچ ہے۔ اس کتاب سے رہنمائی حاصل کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ ضرورت یا میکاولی کے نظریات کیا ہیں۔ مختصراً، یہ حضرات کہتے ہیں کہ سچ اور جھوٹ، حلال اور حرام ان کی کوئی ایسی حدیں نہیں ہیں جو کسی بھی حال میں توڑی نہ جاسکتی ہوں۔ اگر مصلحت کا تقاضا ہو تو اچھا برتاؤ، اچھا اخلاق، اصول یا اقدارِ حیات سے قطع نظر حرام کو حلال کیا جاسکتا ہے اور جو مقاصد حاصل کیے جائیں وہ ذرائع کو جواز فراہم کرتے ہیں۔ دوسری طرف قرآن انسان کے طرزِعمل پر کچھ حدود عائد کرتا ہے جن کو تبدیل یا مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے انحراف درج ذیل آیت کے خلاف ہے:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (الانعام ۶: ۱۱۵)
تمھارے رب کی بات سچّائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے، کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے۔

نظریۂ ضرورت انسان کا بنایا ہوا چیستاں ہے جسے ہمیشہ اللہ کی عطا کی ہوئی اعلیٰ انسانی اقدار کے تابع ہونا چاہیے۔ بعض احکامات افراد کے لیے ہیں جن کا انکار بظاہر پورے معاشرے کو متاثر کرتا ہے۔ جب سچّائی کا حکم اور جھوٹ کی مذمت کی جائے تو دراصل یہ اس آیت کے مطابق ہوتا ہے:

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرہ ۲:۴۲) باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور نہ جانتے بوجھتے حق کو چھپانے کی کوشش کرو۔

اللہ تعالیٰ نے سچائی کو جھوٹ سے ملانے کی بھی مذمت کی ہے۔ مصلحت کے لیے کوئی گنجایش نہیں چھوڑی۔ اس سے بھی زیادہ واضح حکم سورۂ نساء میں ہے جہاں حق و انصاف کی اعلیٰ اقدار کے مقابلے میں نہایت ضروری مصلحتوں کو نظرانداز کر کے ایک طرف رکھ دیا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا قف فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا وَ اِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ (النساء ۴:۱۳۵) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علَم بردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمھارے انصاف اور تمھاری گواہی کی زد خود تمھاری اپنی ذات پر، یا تمھارے والدین اور رشتے داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریقِ معاملہ خواہ مال دار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ ان کا خیرخواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہشِ نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔

آیئے کچھ دوسری آیات پر بھی ایک نظر ڈالیں جہاں مصلحت کی خاطر سچائی سے انحراف کی مذمت کی گئی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا قف هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (المائدہ ۵:۸) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

وقت کی کمی کی وجہ سے قرآن پاک کے فقط چند حوالوں پر اکتفا کیا جا رہا ہے ورنہ اس موضوع پر کہ قرآن نے سچائی کے مقابلے پر مصلحت کی مذمت کی ہے، کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ یہ بدترین قسم کا نفاق ہے جو ان قوموں کا طریقہ رہا ہے جن کو تباہ کر دیا گیا اور ان کی جگہ وہ قومیں لائی

گئیں جنھوں نے اللہ کے حکم کی پیروی کی۔ عمل میں دو رنگی مذموم افراد کا نشان رہا ہے۔ تاریخ اس پر گواہ ہے۔ اس کی سچائی سورۂ عصر سے عیاں ہے جہاں صحیح راہ پر نہ چلنے والوں کو خسران میں مبتلا قرار دیا گیا ہے۔ مختصراً قرآن کا ہر لفظ جھوٹ، نفاق، کردار کے دو غلے پن، مصلحت یعنی نظریۂ ضرورت کی مذمت کرتا ہے۔ اسے وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے اور پورے معاشرے پر اس کا اطلاق کیا جائے تو نظریۂ ضرورت ہی ریاست کی ضرورت کا نظریہ بن جاتا ہے۔ جو بھی منظر ہو، اجتماعی یا انفرادی، یہ نظریہ ہر طرح سے تباہ کن ہے۔ ریاست کی سطح پر یہ پوری قوم کے لیے تباہ کن ہے۔ یہ ہم سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ کردار کا دوغلا پن ہمیشہ جھوٹ کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے۔ سچے لوگ ڈانواں ڈول نہیں ہوتے۔ سچائی اور برائی کو ملانا خدائی فیصلے کی نفی ہے۔

اس موقع پر میں علامہ اقبال کا ایک شعر پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا جن کی قرآن پر گہری نظر ان کی شاعری سے نمایاں ہے ؎

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

بت پرستی کے آج کل متنوع اظہار ہیں۔ نظریات، عقائد، مفروضے ایجاد کیے جاتے ہیں۔ ضرورت کے مطابق تراشے جاتے ہیں اور اللہ کے بجائے انسانوں کو خوش کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ایک شے کے دوسری شے سے تبادلے (quid pro quo) پر سیاست میں تو عمل ہوسکتا ہے لیکن موجودہ حالات میں، انصاف کرتے ہوئے عدالتی معاملات میں کام میں نہیں لایا جاسکتا۔ یہ مناسب وقت ہے کہ مصلحت کے بجائے زندگی کی اعلیٰ اقدار کو اختیار کیا جائے۔ ہمیں اپنے آپ کو اس الزام سے بچانا چاہیے کہ ع خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں۔

جو مختصر وضاحت کی گئی ہے، گو موضوع کا مکمل احاطہ کرنے سے قاصر ہے، تاہم میں یہ قرار دیتا ہوں کہ نظریۂ ضرورت قرآنی احکامات کے خلاف ہے اور میرٹ کی بنیاد پر جو فیصلہ ہو رہا ہو، اسے روکنا تاکہ ریاستی ضرورت کے تحت انتقال اقتدار ہو، نہ انصاف پر مبنی ہوگا نہ جائز نہ قانونی۔ درخواستیں قابلِ سماعت ہیں، ہمارے مختصر حکم نامے ۲۸ ستمبر ۲۰۰۷ء کے مطابق، قبول کی جاتی ہیں۔

امریکی دھمکیاں اور ملکی سلامتی

عبدالغفار عزیز

اپنا سب کچھ امریکی مفادات کی بھینٹ چڑھا دینے کے باوجود، آج پاکستان کو امریکا سے وہ دھمکیاں مل رہی ہیں جو ماضی میں کبھی نہیں ملی تھیں۔ امریکی دانش ور پاکستان کو سابقہ سوویت یونین جیسے دشمن کا 'مرتبہ' دے رہے ہیں۔ کھلم کھلا تجاویز آرہی ہیں کہ اسلام آباد پر امریکی افواج اتار دینا چاہییں۔ پاکستان کے ایٹمی اسلحے کو 'محفوظ' ہاتھوں میں لیتے ہوئے اسے میکسیکو یا کسی قریبی محفوظ وخفیہ مقام پر منتقل کر دینا چاہیے۔ پنجاب، سندھ اور بلوچستان پر قبضہ کر لینا چاہیے۔

عراق پر امریکی فوج کشی کے ایک اہم نقشہ گر، ممتاز عسکری مؤرخ، بش انتظامیہ سے مضبوط نظریاتی وابستگی رکھنے اور امریکن انٹرپرائز انسٹی ٹیوٹ جیسے تھنک ٹینک میں کام کرنے والے امریکی دانش ور فریڈرک کاگان (Frederick Kagan) نے صدر بش کو پاکستان کے بارے میں بھی نقشۂ کار پیش کر دیا ہے۔ کاگان کی اس دستاویز کے حوالے سے برطانوی اخبار گارڈین اپنے یکم دسمبر ۲۰۰۷ء کے شمارے میں سرخی جماتا ہے: ''پاکستانی ایٹمی اسلحہ قبضے میں لینے کا منصوبہ بش کے سپرد کر دیا گیا''۔ کاگان اپنی تجاویز پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: ''سیدھی بات یہ ہے کہ پاکستانی ایٹمی ہتھیار مایوس عناصر کے ہاتھ میں جاتے دیکھ کر امریکا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہ سکتا''۔ خود گارڈین ایک عسکری ماہر اور امریکی وزارتِ خارجہ کے سابق اعلیٰ عہدے دار کے حوالے سے لکھتا ہے: ''اگرچہ حکومتوں کو بعض اوقات ناقابلِ تصور امور پر بھی سوچ بچار کرنا ہوتی ہے، لیکن یہ خیالات اور تجاویز واشنگٹن کے عسکری کیمپ پر نمایاں اثر ونفوذ رکھنے والے ایک ایسے شخص کی طرف سے آئی ہیں، جس کے مشوروں پر عمل کر کے امریکی افواج کو عراق میں اپنی

مشکلات کم کرنے میں مدد ملی ہے''۔ اس لیے انھیں نظرانداز کرنا نادانی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

کاگان نے پاکستان پر فوج کشی کی بات کرتے ہوئے پاکستانی فوج کے بارے میں بھی تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے اور پاک فوج کو تقسیم کرنے کی ناپاک خواہش کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتا ہے: ''ہمیں [پاکستان کی] صورت حال کا مکمل اور ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانا ہوگا۔ ہمیں اس بحران کا مقابلہ کرنا ہوگا جو ہمارے لیے اسی طرح ایک بڑا خطرہ بن سکتا ہے جس طرح کبھی سوویت ٹینک ہمارے لیے خطرہ تھے''۔ وہ جانتا ہے کہ پاکستان پر حملہ بہت مہنگا سودا ہوگا، لیکن جو راستہ وہ منتخب کرنا چاہتا ہے، وہ حملے سے بھی زیادہ مہلک ہے، کہتا ہے: ''ہم حملہ نہیں کر سکتے، ہم صرف پاکستانی فوج کے بعض عناصر کے اشتراک سے کارروائی کر سکتے ہیں...... وزیرستان اور شمال مغربی سرحدی علاقے میں لڑتے لڑتے پاکستانی فوج نفسیاتی طور پر شکست خوردہ ہوچکی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ وہاں سے شکست کھا کر نکل آئے، اپنے پیچھے ایک خلا چھوڑ آئے اور وہاں انتہاپسند آجائیں۔ ایک خراب صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ فوج تقسیم ہوجائے اور اس کا انتہاپسند گروہ ایٹمی اسلحے پر قبضہ کرلے...... یہ ٹھیک ہے کہ فوجی افسروں اور حکمرانوں کی ایک بڑی تعداد اعتدال پسند ہے، واضح رہے کہ امریکا کی یہی سوچ شاہِ ایران کی حکومت کے بارے میں بھی تھی، مگر دیکھو وہاں ۱۹۷۹ء میں کیا ہوا''۔

عراق کے ایٹمی اور کیمیائی اسلحے کا ہوّا کھڑا کر کے اس پر تباہی مسلط کر دینے، ایران پر ایٹمی اسلحے کی تیاری کے الزامات کی آڑ میں دھمکیوں اور پابندیوں کے طوفانوں کے بعد اب پاکستانی ایٹمی اسلحہ انتہاپسندوں کے ہاتھ لگ جانے کی احمقانہ بات کو اپنی منصوبہ بندیوں کا مرکز و محور بنایا جا رہا ہے۔ کاگان اور کئی امریکی دانش ور اس سے پہلے بھی متعدد بار ایسے ہی مسموم و مذموم خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ ۱۸ نومبر ۲۰۰۷ء کے نیویارک ٹائمز میں 'پاکستان کی تباہی، ہمارا اصل مسئلہ' کے عنوان سے کاگان اور مائیکل ہینلون (Michael Hanlon) نے لکھا ہے کہ ایک تباہ ہوتے ہوئے پاکستان کو استحکام بخشنے کا ہدف حاصل کرنا امریکا اور اس کے حلیفوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ ۱۶ کروڑ کی آبادی اور عراق سے پانچ گنا زیادہ رقبے پر مشتمل پاکستان کے خلاف کوئی عسکری کارروائی کرنے کے لیے تقریباً آدھی دنیا کا سفر طے کرنا ہوگا، جو طویل وقت کا متقاضی بھی ہوگا اور پھر جب تک ہمارے پاس اس بارے میں دقیق معلومات نہ ہوں کہ پاکستان کا ایٹمی

مواد کہاں کہاں ہے، ہم بمباری کرنے اور اسپیشل فورس استعمال کرنے پر بھروسا نہیں کرسکتے۔ سرسری اندازہ یہ ہے کہ ہمیں پاکستان جیسے ملک کے خلاف عسکری کارروائی کرنے کے لیے تقریباً ۱۰ لاکھ فوجی درکار ہوں گے۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود اگر ہمیں کامیابی کی امید نظر آئے تو ہمیں پاکستانی حکومت کی مکمل تباہی سے پہلے پہلے کارروائی کرنا ہوگی اور اس کے لیے ہمیں 'اعتدال پسند' قوتوں کا تعاون درکار ہوگا۔

اعتدال پسند قوتوں کے تعین اور ان سے تعاون کے بارے میں امریکی انتظامیہ کے خودساختہ پیمانے سب پر عیاں ہیں۔ اب تک اکلوتی با اعتماد اعتدال پسند' طاقت' جنرل (ر) پرویز مشرف اور ان کے حواری تھے، لیکن اب کئی دیگر پارٹیاں بھی طائفے میں شامل کی جارہی ہیں۔ پرویز مشرف کے بارے میں ان کی رائے جاننے کے لیے مارون جی وائن بوم کے ایک تازہ انٹرویو سے چند جملے پیش خدمت ہیں۔ موصوف پاکستان اور افغانستان کے حوالے سے اتھارٹی ہیں۔ وہ ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۳ء تک امریکی وزارتِ خارجہ میں باقاعدہ ذمہ دار بھی رہے ہیں، کہتے ہیں: ''بنیادی حقیقت یہ ہے کہ مشرف ہم سے جتنے بھی مخلص ہوں، وہ القاعدہ وطالبان کے خلاف امریکا سے تعاون کے لیے جتنے بھی پُرعزم ہوں لیکن اب وہ عملاً ایسا کر دکھانے کی صلاحیت کھو چکے ہیں...... ''صدر پرویز مشرف نے وردی اُتار کر سیاسی لحاظ سے کچھ وقت مزید حاصل کرلیا ہے، لیکن رہے گا وہ ایک کمزور مشرف''۔

اس سب کچھ کے باوجود وائن بوم اور کئی دیگر امریکی ذمہ داران کی آرا اور امریکی پالیسی کا نچوڑ یہ ہے کہ امریکا فی الحال اسی کمزور پرویز مشرف کو حکمران دیکھنا چاہتا ہے۔ 'وہ بے بس ہے'، 'وہ مزید اقدامات کی استعداد نہیں رکھتا'، 'وہ کمزور تر ہو چکا ہے' جیسے بیانات کے چابک، اس کمزور لیکن مطلق العنان حکمران سے اپنی مرضی کے مزید اقدامات کروانے کا بہانہ ہیں۔ کمزور حکمران کو اقتدار میں رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے مزید 'روشن خیال' عوامی طاقت بھی فراہم کر دی جائے۔ انتخابات میں بظاہر برسرپیکار پارٹیوں کو انتخابات کے بعد یکجا کر دیا جائے اور اس طرح اعتدال پسند طاقت کا ایک نیا فارمولا تخلیق کرنے کی آخری کوشش کی جائے۔

امریکی عسکری ماہرین اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کے حوالے سے امریکی دوستی کا دم بھرنے والے پاکستانی بھی بہت سے تحفظات رکھتے ہیں۔ ان سے

اپنی مرضی کے مزید اقدامات کروانا کوئی بہت آسان ہدف نہیں ہوگا۔ لیکن مختلف متبادل تجاویز کے بعد زیادہ تر آرا اسی پر مجتمع ہوتی ہیں کہ براہِ راست فوج کشی کی تیاریاں کی جائیں، محدود فوجی کارروائیاں جاری رکھی جائیں، کمزور حکمرانوں کو اپنی دست نگر سیاسی قیادت کی کرم خوردہ بیساکھی فراہم کی جائے، پھر مزید دھمکیوں کے ذریعے پاکستان کی وحدت اور ایٹمی اسلحے سمیت پاکستان کے تمام ملّی مفادات کو ایک ایک کر کے خاک میں ملا دیا جائے۔ اس حکمت عملی میں بوقت ضرورت بھارت کو بھی آزمودہ ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان پر امریکی حملے کی دھمکیوں کے ساتھ ساتھ بھارت کی تعریفوں کا سلسلہ بھی عروج پر ہے۔ مثال کے طور پر سابق نائب وزیر خارجہ کارل انڈرفرتھ (Karl Inderfurth) کا یہ مضمون ملاحظہ فرمائیے: India and the United States: A rare Stable Partnership (بھارت اور امریکا ایک منفرد مستحکم اشتراکِ کار)۔ ۱۸ نومبر ۲۰۰۷ء کو شائع شدہ اس مضمون میں وہ آیندہ سال آنے والی نئی امریکی انتظامیہ کو رہنمائی دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''نئی امریکی انتظامیہ کے لیے اصل چیلنج یہ ہوگا کہ صدر کلنٹن اور صدر بش نے بھارت امریکا تعلقات کی جو مضبوط بنیاد قائم کی ہے، وہ ان تعلقات کو اگلے مراحل تک لے جائیں''۔ امریکی بھارتی مشترکہ مفادات کی فہرست گنواتے ہوئے تان اس بات پر توڑتے ہیں: ''ہم دونوں جہادی دہشت گردی کو شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں''۔

ان مشترکہ مفادات کو حاصل کرنے اور دوستی کو مزید مستحکم کرنے کے لیے ممکنہ اقدامات میں وہ جہاں یہ تجویز دیتے ہیں کہ بھارت کو سیکورٹی کونسل کا مستقل رکن بنانے کے لیے امریکا کھل کر اس کی مدد کرے، امریکا بھارت عسکری تعاون میں بے محابا اضافہ ہو، دہشت گردی کے خلاف کارروائیوں میں ایک دوسرے کی پشتیبانی ہو، وہیں یہ بھی کہتے ہیں کہ امریکا اور بھارت مل کر پاکستان کو ایک 'محفوظ'، 'جمہوری' اور 'مستحکم' ریاست بنانے کی جدوجہد کریں۔ حالیہ سیاسی بحران کی وجہ سے اگر شدت پسند عناصر نے پاکستان کے جوہری اسلحے پر قبضہ کرلیا تو ''امریکا اور بھارت کے لیے اس سے بڑا خطرہ کوئی اور نہیں ہوسکتا''۔ ان خیالاتِ 'عالیہ' کی روشنی میں بھارتی حکمرانوں کا یہ فرمان بھی اذہان میں تازہ کرلیجیے جو انھوں نے پاکستانی ایٹمی ہتھیاروں کے محفوظ ہاتھوں میں ہونے کے بارے میں دیا ہے۔ گویا یہ ہتھیار محفوظ ہونے یا نہ ہونے کا سرٹیفکیٹ بھارت کو دینا ہے۔

اپنے اس مقالے میں امریکی دانش ور بھارت کے ساتھ اپنے اکلوتے اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''بھارت نے ہمارے کہنے کے باوجود ابھی تک جوہری پھیلاؤ کو روکنے کے معاہدے پر دستخط نہیں کیے، لیکن اس طرح کے مسائل حل کرنے کے لیے مزید وقت اور صبروتحمل کی ضرورت ہے''۔

ظاہر ہے کہ صبروتحمل پر مشتمل پالیسی تو صرف بھارت یا اسرائیل جیسے اپنوں کے لیے ہوسکتی ہے، رہے پاکستان سمیت تمام مسلم ممالک تو یہ دہشت گرد گنوار فوج کشی کے علاوہ کوئی زبان نہیں سمجھتے۔ اس لیے اس کی تیاریاں ہی نہیں، عملی اقدامات بھی جاری ہیں۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ کیا مسلم اُمت اور پاکستانی قوم ان خطرات سے پوری طرح آگاہ ہے؟ جن تازہ دم اعتدال پسندوں کو قریب المرگ اعتدال پسند کی مدد کے لیے لایا جا رہا ہے، کیا وہ خود بھی جانتے ہیں کہ ان کی گردن پر کون سا جوالا دا جا رہا ہے؟ کیا بے نظیر جانتی ہیں کہ جس ایٹمی پروگرام کی سزا ان کے والد کو دی گئی، اب انھی کے ہاتھوں اس کے گرد اپنا مکروہ جال تنگ سے تنگ کرنے کے خواب دیکھے جارہے ہیں؟ اور کیا 'سب سے پہلے پاکستان' والے ریٹائرڈ جنرل صاحب اور ان کے ہم نوا یہ جانتے ہیں کہ اپنی قوم اور اپنے ضمیر سے غداری کرنے والے میر جعفر اور میر صادق کا دنیا و آخرت میں کیا انجام ہوتا ہے؟ ایک اور سوال ہم میں سے ہر شخص کو خود سے پوچھنا ہے کہ اب، جب کہ خطرات گھر کی منڈیروں سے جھانک رہے ہیں، ہم ان کے مقابلے کے لیے کیا تیاری کر رہے ہیں؟ کیا رب سے لو لگاتے ہوئے، منظم اجتماعیت سے وابستہ ہوکر مؤثر منصوبہ بندی کے ذریعے، ہر قربانی کے لیے تیار ہوکر میدانِ عمل میں اُترنے کا وقت نہیں آن پہنچا؟ رہیں امریکی دانش وروں کی دھمکیاں تو وہ خاطر جمع رکھیں۔ امریکی عوام کی غالب اکثریت سمیت دنیا کا ہر باشعور شخص جانتا ہے کہ یہ دھمکیاں نہیں خودکشی پر اصرار ہے اور اگر کسی کو یہ حقیقت سمجھ نہ آئے تو عراق یا افغانستان میں موجود کسی امریکی فوجی یا اس کے خاندان سے دریافت کرلے۔

ڈی این اے ــــ تخلیق الٰہی کا کرشمہ

انجم اقبال°

ڈی این اے (DNA) کی معلومات تک پہنچنا سائنس کی تاریخ کا بڑا اہم سنگ میل ہے۔ مادے پر مبنی کائنات کی تعبیر جو جدید دور کا بڑا اہم حصہ بن گئی تھی، اب جدید دور کے بعد، مابعد الجدید یا (post modern) دور میں خود سائنس کے ذریعے اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے۔ انجام کار وہ سائنس جو خدا کی منکر ہوگئی تھی اب خدا کا اقرار کیا چاہتی ہے۔ دنیاے سائنس نے مان لیا ہے کہ چارلس ڈاروَن کے تصورِ ارتقا نے انسانیت کے ۱۵۰ سال خراب کیے ہیں۔ اس تصور کے تحت بے جان ایٹموں (atoms) نے کسی مبہم طریقے سے اپنے آپ کو اس طرح استوار کرلیا کہ وقت گزرتے یہ ایٹم زندگی کی متعدد قسموں کو اختیار کرتے گئے اور جان دار شکلیں دھارتے گئے اور آخرکار بندر کی شکل سے گزرتے ہوئے انسان کے وجود کا باعث ہوگئے۔ قدیم ترین تہذیبوں، یونان میں سقراط سے پہلے اور مصر اور بابی لون میں بھی انسانوں کی زندگی کو تغیر پذیر تو ہم پرستانہ منزلوں (stages) میں تقسیم کیا گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ ڈی این اے کی تفصیل بتائی جائے کہ اس دریافت نے کس طرح خدا کے قریب ہونے کا راستہ ہموار کیا ہے، ہم یہ بتاتے چلیں کہ ۱۹ویں صدی میں تین بڑی طاقت ور آوازیں گونجتی رہی ہیں جس میں سے ہر آواز کے لاکھوں پیروکار پیدا ہوئے۔ ان میں ایک آواز کارل مارکس کی تھی جس نے تمام دنیا کے محنت کشوں اور کاری گروں کو یک جہتی کا پیغام دیا۔

° مکہ مکرمہ، سعودی عرب

اس کے تصورات اتنے جامع قرار پائے کہ تاریخ، معاشیات و مالیات، سیاست اور معاشرے کے مکمل احاطے کے ساتھ علم و دانش کی بے اندازہ شقوں کو متاثر کر گئے۔ یہ انقلاب برپا کرنے اور اپنی دنیا آپ تبدیل کرنے والے خیالات تھے جو اپنی ابتدائی شکل میں ۱۹۴۸ء میں اشتراکی منشور (Communist Manifesto) کی شکل میں سامنے آئے۔ یہ مادہ پرست پس منظر میں صرف دولت کی تقسیم پر سماج کی تعمیر کا وہ خواب تھا جس کی تعبیر روس میں بڑے پیمانے پر آزمائی گئی۔ روے زمین پر اس تصور کے کروڑوں پیروکار پیدا ہوئے اور اس کی ہم نوائی میں زندگی کی تعبیر پھر سے کی جانے لگی، خدا ناشناس علمی عنوانات: روشن خیالی، ترقی پسندی، آزاد خیالی، عورتوں کے حقوق جیسے سیکڑوں خوب صورت الفاظ تراشے گئے جو عام آدمی کو خوش کرنے اور ایک معیاری انصاف پسند دنیا بنانے کا ولولہ انگیز طوفان تھا جو بڑے بڑوں کو بہالے گیا۔ روس کے خاتمے کے ساتھ یہ اپنے انجام کو پہنچا۔ اس کے تمام ہم نوا اور پیروکار اپنے اپنے ملبوں میں واپس جانے کے راستے تلاش کرنے پر مجبور ہو گئے۔

دوسری آواز فرائڈ کی تھی جو ۱۸۸۲ء میں شعور اور تحت الشعور کی بحث کے ساتھ اُبھری، اس نے تجربات سے ثابت کیا کہ بھولی ہوئی یادیں اور تجربات تحت الشعور میں محفوظ ہوجاتے ہیں اور ان کو واپس یاد دلایا جاسکتا ہے۔ ان تجربات کو کرنے کے لیے اس نے نفسیاتی تجزیے (psychoanalysis) کا وہ تجرباتی طریقہ پیش کیا کہ رومانی دنیا کے انسانی ذہن کے لیے لامحدود وسعتوں تک ترقی کرسکنے کے امکانات وا کردیے۔ یورپ، امریکا اور دنیا بھر میں نفسیاتی تجزیے کی تجربہ گاہیں کھل گئیں۔ فرائڈ کی سب سے زیادہ مشہور تشریح اس کا لبیڈو (Libido) نظریہ تھا جس کے لاتعداد ہم نوا اور بے اندازہ مخالفین بھی سارے عالم میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ لبیڈو نظریہ کے تحت انسان اپنی تمام نشوونما میں پیدا ہوتے ہی ماں کا دودھ مانگنے کے وقت سے موت کی آخری ہچکی تک ایک جنسی تسکین کا متمنی رہتا ہے۔ جنسی لذت کی کمی اور زیادتی کے تجربات کے تحت ہی انسان کی تمام جسمانی، ذہنی، دماغی، عملی اور دانش مندی کی کارفرمائیاں وجود پاتی ہیں۔ اس نظریے کو انسان کے تمام اوامر زندگی پر محیط کرنے کی کوشش عالمی پیمانے پر کی گئی۔ یہ خود پسندی (Narcissism) تھی، یعنی وہ نفسی کیفیت جس میں انسان اپنی ہی ذات کو کامل اور خود اپنے ہی

عشقِ ذات میں محو رہنا کافی سمجھتا ہے۔ اپنی جسمانی لذتوں کے پانے میں گم ہو جانے اور اسی کو مرکز حیات اور مقصد کائنات سمجھنے اور سمجھانے والوں کی ایسی شدید گونج تھی جو مختلف ناموں سے ۱۹ویں صدی میں اٹھی اور پوری ۲۰ویں صدی میں گونجتی رہی اور ۲۱ویں صدی کے آتے آتے غلط اور بے بنیاد ثابت کر دی گئی۔

تیسری آواز ڈاروِن کی تھی جس نے انسان کو بندر کا رشتے دار بتایا اور فلسفۂ ارتقا کے دیوانے گھر گھر نظر آنے لگے۔

۲۰۰۰ء میں یہ ثابت ہوا کہ جب روشنی کی رفتار کو کئی گنا بڑھایا گیا تو اس تجربے کے دوران سائنس دان یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس تجربے میں تاثیر (effect) اس کے سبب (cause) سے پہلے ہوئی۔ ایک اخبار نے لکھا کہ یہ ثابت ہوا ہے کہ کسی سبب سے پہلے اس کی تاثیر کا ہونا ممکن ہے۔ اب تک خیال تھا کہ کسی بھی اثر، انجام، نتیجہ یا حاصل کو پانا اس کے سبب، وجہ یا علّت کے ہونے کے بعد ہی ممکن ہے۔ یہ تجربہ ثابت کرتا ہے کہ کسی واقعے کی انتہا اس کی ابتدا سے پہلے بھی ممکن ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ واقعہ خود اپنے آپ میں ایک تخلیق (creation) ہے۔ یہ کسی دوسرے واقعے کا ردعمل نہیں ہے۔ اب تک جو کہا جاتا رہا ہے کہ ہر عمل کسی عمل کا ردعمل ہے یا یہ کہ There is reaction to every action، یہ غلط ثابت ہوتا ہے۔ ۲۵ جون ۲۰۰۰ء کو یہ بھی ثابت ہوا کہ ایک قدیم چڑیا کا فوسل (fossil) جو لاکھوں سال بعد دریافت ہوا وہ بھی چڑیا ہی تھا یعنی لاکھوں سال پہلے سے اب تک اس چڑیا میں کوئی ارتقا (evolution) نہیں ہوا۔ آج کی چڑیا بھی بالکل وہی چڑیا ہے جو لاکھوں سال پہلے تھی۔ ابھی ۲۰۰۱ء میں انسانی جینوم (genome) پراجیکٹ مکمل ہوا ہے جس میں زندگی کے حیاتیاتی میک اپ (biological makeup) کا مکمل نقشہ تیار کیا گیا جو اس صدی کا بڑا سائنسی کارنامہ ہے۔ اس پراجیکٹ کے نتیجے میں یہ بات اور واضح ہوگئی ہے کہ خدا کی تخلیق جو انسان کی شکل میں ودیعت کی گئی ہے وہ زندہ اشیا میں سب سے عظیم تخلیق ہے۔ ماہرین ارتقا کوشش کر رہے ہیں کہ انسانی جین (gene) اور جانوروں کے جین میں مشابہت کی افواہ پھیلا کر کچھ مواد اپنے مطلب کا نکالنے میں کامیاب ہو جائیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دانش وروں اور سائنس دانوں کی بڑی تعداد نظریۂ تخلیق کی حامی (creationist) ہوتی جا رہی ہے جن کا

یہ اعتراف ہے کہ دنیا کسی عظیم قوت کی قوتِ تخلیق سے وجود میں آئی ہے۔ بتدریج ترقی کے مراحل سے گزرتی ہوئی اپنی موجودہ حالت کو نہیں پہنچی ہے۔ آیندہ جو مختصر تفصیلات بیان ہوں گی ان کی روشنی میں آپ خود اندازہ لگا سکیں گے کہ خدا ناشناس سائنس اب اپنے اختتام کو پہنچنے والی ہے اور ۲۱ویں صدی انسان کو اپنے کھوئے ہوئے خدا سے پھر ملا دے گی۔

ڈی این اے زندگی کا کوڈ

ڈی این اے میں موجود فرمانِ الٰہی جب سائنس کی سمجھ میں آنے لگا تو سب سے پہلے یہ مانا جانے لگا کہ زندہ اشیا ایسی مکمل اور پیچیدہ ترتیب و ترکیب کا مرکب ہیں کہ یہ حادثاتی طور پر کسی اتفاق کے تحت وجود میں نہیں آسکتیں جب تک یہ کسی بڑے ماہر اور قادر مطلق بنانے والے کی کارگزاری نہ کہی جائے۔ اگر کسی مقام پر اینٹ، پتھر، گارا، مٹی، قالین، ایرکنڈیشنر، ٹی وی اور ریفریجریٹر اور تمام رہایشی سامان موجود ہو اور پھر اچانک ایک حادثہ یا اتفاقی واقعہ ایسا ہو جائے کہ یہ سب مل کر بادشاہ سلامت کا محل بن کر اُبھر آئے، یہ جادو کی کہانی تو ہوسکتی ہے ایک سائنسی حقیقت کبھی نہیں ہوسکتی۔ اب ڈی این اے میں چھپے ہوئے تین بلین (3×10^9) یا ۳ ارب کیمیائی حروف کو decode کرنا اور انسانی ڈی این اے میں موجود ۸۵ فی صد ڈاٹا صحیح ترتیب و سلسلے (sequence) میں لانا ممکن ہوگا۔ اتنا اہم اور کامیاب پراجیکٹ بھی اس کے لیڈر ڈاکٹر فرانسس کولنز (Francis Collins) کے بقول ابھی پہلا قدم ہے جو ڈی این اے میں چھپی معلومات حاصل کرنے کی طرف اٹھایا گیا ہے۔ معلومات کے اس ذخیرے کو حاصل کرنے میں اتنا زمانہ کیوں لگا اس سوال کا جواب ملے گا اگر ہم یہ جاننے کی کوشش کریں کہ ڈی این اے میں کس نوعیت کی معلومات پوشیدہ ہیں۔

ڈی این اے کی دنیا

ڈی این اے ہمارے جسم کے ۱۰۰ ٹریلین (10^{14}، یا ۱۰۰ کھرب) خلیوں میں سے ہر ایک خلیے کے مرکزے (nucleus) میں بڑی حفاظت سے موجود ہوتا ہے۔ ہر خلیے کا قطر ۱۰ مائی کرون (micron) ہوتا ہے۔ مائی کرون $10^{-6}m$ کو کہتے ہیں۔ گویا میٹر کا دس لاکھ واں حصّہ یا ملی میٹر کا

ایک ہزارواں حصہ۔ اتنے چھوٹے خلیے کے درمیان ڈی این اے محفوظ ہوتا ہے۔ اس ڈی این اے میں انسانی جسم کی ساخت اور بناوٹ کی تمام تر تفصیلات اتنی وسعت، گیرائی اور گہرائی کے ساتھ لکھی ہوئی ہیں کہ اس کا وجود اللہ رب العزت کی صناعی کی اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ اپنے سمجھنے کے لیے ان معلومات کو صرف سلسلۂ ترتیب میں لاکر انسان پھولا نہیں سما رہا ہے۔ اس علم کو ایک عظیم الشان شعبۂ علم سے وابستہ کر کے اس کو جینیات (genetice) کا نام دیا گیا ہے۔ ۲۱ویں صدی کی یہ علمی شق ابھی گھٹنوں چلنے کی عمر میں ہے۔ اس میدان میں ابھی اور نہ جانے کیا کیا انکشافات ہونے ہیں۔

ڈی این اے میں زندگی

آج مثلاً ۲۵ سال کی عمر میں ہم اپنا سراپا آئینے میں دیکھیں تو یہ بے داغ جسم، یہ حسین و پُرکشش شکل و شباہت، یہ صحت و تندرستی، یہ علم و دانش سے آراستہ ذہن وعقل کس طور ترقی کرتے ہوئے اس حال کو پہنچیں گے، یہ علم ۲۵ سال اور ۹ ماہ پہلے اس ڈی این اے میں لکھ دیا گیا تھا جو ماں کے پیٹ میں سب سے پہلے بارآور شدہ بیضے (fertilized egg) کے خلیے کی شکل میں نمو پایا تھا۔

اتنا ہی نہیں ہماری لمبائی چوڑائی، وزن، ناک نقشہ، چہرہ مہرہ، بالوں اور آنکھوں کا رنگ، جلد کی رنگت، خون کی قسم وغیرہ نطفہ ٹھیرنے سے شروع ہوکر موت تک روز بروز ماہ بہ ماہ، سال بہ سال تبدیلیوں کا حال ایک مکمل تسلسل کے ساتھ ڈی این اے میں موجود رہتا ہے۔ مثلاً اس میں لکھا رہتا ہے کہ کب کب خون کا دباؤ زیادہ ہوگا اور کب کم رہے گا۔ کب سر کا پہلا بال سفید ہوگا اور کب دُور کی اور قریب کی نظر کمزور ہو جائے گی۔

انسانی خلیے میں ضخیم انسائی کلوپیڈیا

ہم معلومات کے ذخیروں کو انسائی کلوپیڈیا کی طرز پر جانتے ہیں۔ ڈی این اے میں پوشیدہ معلومات کا ذخیرہ کوئی معمولی ذخیرہ نہیں۔ ایک ڈی این اے میں موجود معلومات کو اگر کتابی شکل میں منتقل کیا جائے تو یہ برطانوی انسائی کلوپیڈیا کے ۱۰ لاکھ صفحات پر مکمل ہوگا۔

ذرا تصور کریں کہ انسانی جسم کے ۱۰۰ ٹریلین خلیوں میں سے ہر خلیے کے مرکزے کے اندر ایک مالیکیول (molecule) جس کا نام ڈی این اے ہے، ملتا ہے۔ اس کا سائز ایک ملی میٹر کا ایک ہزارواں حصہ ہے اور اس میں وہ معلومات درج ہیں جو دنیا کے سب سے بڑے انسائی کلوپیڈیا بریٹانیکا سے ۴۰ گنا زیادہ ہیں جو اسی انسائی کلوپیڈیا جیسی ۹۲۰ جلدوں میں سما سکے گا، جس میں متعدد معلومات کی ۵ بلین (5×10^9) قسمیں یا جزئیات (pieces) محفوظ ہیں۔ اگر ہر ایک جز کو پڑھنے پر صرف ایک سیکنڈ صرف کیا جائے اور ۲۴ گھنٹے متواتر پڑھنے کا سلسلہ رہے تو اسے ایک بار پڑھنے کے لیے ۱۰۰ سال لگ جائیں گے۔ ۹۲۰ جلدوں کی ان کتابوں کو اگر ایک دوسرے کے اُوپر سجایا جائے گا تو ۷۰ میٹر اونچا کتابوں کا مینار تیار ہو جائے گا۔ یہ سب معلومات اس ذرے میں سما دی گئی ہے جو پروٹین، چربی اور پانی کے چند مالیکیولوں سے مرکب ہے۔

جی جی تھامسن نے لکھا تھا کہ ہماری زمین پر کل جان دار اشیا ایک ہزار ملین ہیں۔ ان تمام اشیا کی معلومات ڈی این اے کی شکل میں جمع کی جائے تو چائے کے ایک چمچے میں آ جائیں گی اور پھر بھی جگہ خالی رہے گی۔

خلیے میں دانائی

جسمِ انسانی کے سارے ۱۰۰ ٹریلین خلیے عجب حکمت اور دانش مندی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ یہ بظاہر بے جان ایٹموں کا مجموعہ ایک بے روح شے ہونا چاہیے۔ ہم اگر تمام عناصر کے ایٹم جمع بھی کر لیں، ان کو کسی بھی ترتیب سے لگا لیں مگر وہ دماغ، وہ سمجھ بوجھ اس ذخیرۂ ایٹم سے حاصل نہیں کر سکتے جو کسی عمل کو سلیقے، سلسلے اور ترتیب کے ساتھ انجام دینے کے لیے ضروری ہے۔ جس طرح ہر عقل و سمجھ بوجھ والے کام کے لیے ضروری ہے کہ کسی دانش مند نے اس کام کو انجام دیا ہو، وہ کمپیوٹر ہو یا کوئی اور کام ہو، اسی طرح ڈی این اے بھی اپنے بنانے والے سے عقل و دانش اور سمجھ بوجھ لے کر آیا ہے۔

ڈی این اے کی زبان اور قوت گویائی

ہماری زبان میں 'الف' سے 'ے' تک حروف تہجی ہیں۔ انگریزی زبان A سے Z تک

۲۶ حروف سے بنتی ہے۔ ڈی این اے کی زبان میں صرف چار حروف ہیں: A-T-G-C۔ ان میں سے ہر ایک حرف ان خاص بنیادوں (bases) میں سے ایک ہے جو نیوکلیوٹائیڈس (nucleotides) کہلاتے ہیں۔ دسیوں لاکھ bases ایک ڈی این اے میں قطار در قطار ایک بامعنی ترتیب اور سلسلے کی کڑی بنائے رکھتے ہیں اور یہ سب مل کر ایک ڈی این اے کا مالیکیول بناتے ہیں۔

G،T،A اور C میں سے کوئی بھی دو مل کر ایک اساسی جوڑا بناتے ہیں جسے اساسی جوڑا (base pair) کہا جاتا ہے۔ یہی اساسی جوڑے اُوپر تلے جمع ہو کر جین بن جاتے ہیں۔ ہر جین جو کسی مالیکیول ڈی این اے کا ایک حصہ ہوتا ہے، انسانی جسم کے کسی نہ کسی حصے کے بارے میں معلومات محفوظ کیے ہوئے ہوتا ہے۔ یہ اس جسمانی حصے کی نمایاں خصوصیات، وضع قطع، ڈیل ڈول، ہیئت، خدوخال، صورت، شکل، حلیہ، رنگ و روپ جو کسی فردِ خاص کی انفرادیت سے متعلّق مفصل کیفیت کہی جاسکتی ہے، اس جین میں درج ہوتی ہے۔ اب انسان کی لاتعداد خصوصیات ہیں۔ یہ لمبائی ہو، آنکھوں کا رنگ ہو، ناک بھوں کی ندرتیں ہوں یا کان بڑا یا چھوٹا ہو، یہ سب جین میں موجود پروگرام کے مطابق بنتے اور سنورتے جاتے ہیں اور جسم کا ہر ہر حصہ جین کے حکم کے مطابق پروان چڑھتا ہے۔

ایک انسانی خلیے کے ایک ڈی این اے میں ۲ لاکھ جین ہوتے ہیں۔ ہر جین مخصوص نیوکلیوٹائیڈس کے بالکل انفرادی سلسلۂ ترتیب سے بنا ہوتا ہے۔ ان نیوکلیوٹائیڈس کی تعداد اس پروٹین کی قسم پر منحصر ہوتی ہے جس سے یہ وجود پاتا ہے۔ پروٹین کی یہ تعداد ۱۰۰۰ سے ایک لاکھ ۸۶ ہزار تک ہوسکتی ہے۔ اس جین میں جسم انسانی میں موجود ۲ لاکھ قسموں کی پروٹین کا کوڈ بھی چھپا ہوتا ہے اور وہ نظام بھی موجود رہتا ہے جس کے تحت یہ تمام پروٹین ضرورت کے مطابق جسم میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

خیال رہے کہ ایک جین بے چارہ ڈی این اے کا صرف ایک معمولی سا حصہ ہے۔ ۲ لاکھ جینز میں محفوظ معلومات یا کوڈ ڈی این اے میں موجود کل معلومات کا صرف ۳ فی صد ہی ہوتی ہیں۔ ۹۷ فی صد دفترِ علم ابھی ہماری بساط آگہی کے لیے پردۂ راز میں ہے۔ یہ بات تو مان لی گئی ہے کہ یہ ۹۷ فی صد علم جس تک ابھی انسان کی رسائی ممکن نہیں ہوسکی ہے، انسانی خلیے کی بقا اور ان

مکانیات (mechanisms) سے متعلق جو انسانی جسم میں انتہائی پیچیدہ عوامل کے کنٹرول کا باعث ہوتے ہیں بڑی ناگزیر معلومات رکھتے ہیں۔ صرف ۳ فی صد معلومات کا پتا ملنے پر عقل انسانی حیران ہے، دانش وفکر پر سکتہ طاری ہے، ابھی مزید ۹۷ فی صد پوشیدہ معلومات تک پہنچنا ایک لمبا سفر ہے جو جاری ہے۔

جین خود بھی کروموسوم (chromosomes) میں واقع ہوتے ہیں۔ جنسی خلیے کے علاوہ ہر انسانی خلیے میں ۴۶ کروموسوم ہوتے ہیں۔ ہر کروموسوم ایک کتاب علم کی طرح ہے کہ ایک انسان کے متعلق تمام معلومات ۴۶ جلدوں کی کتابوں میں بند رہتی ہے، اور یہ سب بسیط معلومات کا وہ خزانہ ہے کہ جسے ورقِ کتاب پر لایا جائے تو برطانوی انسائی کلوپیڈیا کی ۹۲۰ جلدوں تک پھیل جائے۔

ہر انسان کے ڈی این اے میں حروف A، T، G اور C کا سلسلہ (sequence) مختلف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روے زمین پر جتنے انسان پیدا ہو چکے ہیں اور قیامت تک جو اسی طرح پیدا ہوتے رہیں گے، وہ تمام کے تمام ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

ذرا سوچیں کہ ہر انسان کے تمام اعضا کا نام مختلف نہیں ہے، یعنی آنکھ، ناک، منہ، دل، گردہ وغیرہ سب کے پاس ہے۔ پھر بھی ہر شخص کچھ ایسے خاص انفرادی اور بڑے تفصیلی طریقے پر پیدا ہوا ہے کہ سب کے سب ایک خلیے کے تقسیم در تقسیم ہونے کے عمل سے پروان چڑھنے کے باوجود ایک ہی بنیادی بناوٹ رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

ہمارے تمام اعضا ایک منصوبے کے تحت پروان چڑھے ہیں جو ہماری جین میں لکھا ہوا ہے۔ سائنس دانوں نے جو خاکہ مکمل کیا ہے اس کے تحت جسم کے مختلف اعضا کو کنٹرول کرنے والی جین کی تعداد مختلف ہے۔ مثلاً ہماری کھال کو جو جین کنٹرول کرتی ہیں ان کی تعداد ۲۵۵۹ ہے۔ اسی طرح دماغ کو ۲۹۹۳۰، آنکھ کو ۱۷۹۴، لعابِ دہن کو ۱۸۶، دل کو ۶۲۱۶، سینے کو ۴۰۰۱، پھیپھڑوں کو ۱۱۵۸۱، جگر کو ۲۳۰۹، آنتوں کو ۳۸۳۸، دماغی پٹھوں کو ۱۹۱۱، اور خون کے سیل کو ۲۲۹۲ جین کنٹرول کرتی ہیں۔

ڈی این اے کے حروف کا سلسلۂ ترتیب انسانی بناوٹ کی تمام تر تفصیلات طے کرتا ہے۔

معمولی سے معمولی تفصیل بھی اس کے احاطے میں ہے۔ صرف آنکھ، ناک، چہرہ مہرہ اور ظاہری حسن و جمال ہی نہیں، ایک سیل میں نصب ڈی این اے انسانی جسم میں موجود ۲۰۶ ہڈیوں، ۶۰۰ پٹھوں (muscles) اور ۱۰ ہزار auditory muscles (کان سے متعلق پٹھے) کے نیٹ ورک اور ۲۰ لاکھ optic nerves (آنکھ سے متعلق) اور ۱۰۰ بلین nerve cells اور تمام کے تمام ۱۰۰ ٹریلین خلیوں کا مکمل ڈیزائن اپنے اندر سمائے ہوئے ہوتا ہے۔

اس وسیع سمندر کا اندازہ لگائیے اور علم کی کائنات کی سب سے پیچیدہ مشین 'آدمی' کے جسم و عقل اور فہم و ادراک کے پروان چڑھنے کا علم حیرت انگیز طور پر ایک ڈی این اے میں قطار در قطار جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر ڈی این اے کے حروف کے سلسلۂ ترتیب (sequence) میں ذرا بھی نقص رہ جائے تو ممکن ہے آپ کی آنکھیں چہرے پر ہونے کے بجائے آپ کے گھٹنے پر نمودار ہو جائیں اور آپ کے ناک، کان، ہاتھ پاؤں، سر اور کمر اپنے موجودہ مقام سے ہٹ کر کسی بے ہنگم جگہ پر وارد ہو جائیں، ڈی این اے کا یہ مکمل نظام آپ کے بے داغ ڈیل ڈول اور ہر اعتبار سے مکمل انسان ہونے کا ضامن ہے۔

اب اگر کوئی کہے کہ ڈی این اے کا منظم سلسلہ کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ ہے یا ناگہانی واقعہ ہے تو کوئی کم عقل بھی یہ بات نہ مانے گا۔ اتفاقات کا امکان یا احتمال، ریاضی میں امکان (probability) کے حساب سے معلوم کیا جاتا ہے۔ یہ وہ نسبت ہے جو کسی اغلب حالت کو جملہ ممکنہ حالات سے ہو۔ آج ریاضیات نے یہ بھی حساب لگا دیا ہے کہ محض اتفاق سے ایک ڈی این اے کے ۲ لاکھ جین میں سے کسی ایک جین کی بھی ترتیب اس مخصوص سلسلے سے ہموار ہو جانے کی نسبت صفر کے برابر ہے۔

فرینک سالسبری (Frank Salisbury) جو خود ایک ارتقا کو ماننے والا سائنس دان ہے، کہتا ہے کہ: ایک درمیانی درجے کے پروٹین میں ۳۰۰ کے قریب amino acids ہوتے ہیں۔ اس کو کنٹرول کرنے والے ڈی این اے جین میں تقریباً ۱۰۰۰ نیوکلوٹائیڈ کی ایک کڑی ہوگی۔ چونکہ ایک ڈی این اے کڑی میں چار قسم (A،T،G،C) کے نیوکلوٹائیڈ ہوتے ہیں، اس لیے ۱۰۰ link والی کڑیاں ۴^۱۰۰۰ قسموں کی ہوں گی۔ الجبرا کے ذریعے logrithms کے استعمال سے

۴^۱۰۰۰ کا مطلب ہوا 10^{600}، یعنی ۱۰ کو ۱۰ سے ۶۰۰ مرتبہ ضرب کرنے سے ایک کے بعد ایک ۶۰۰ صفر لگانے سے جو ہندسہ بنے گا۔ یہ وہ عدد ہے جس کا صرف تصور کیا جا سکتا ہے۔

مزید وضاحت اس طرح کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ تمام ضروری نیوکلوٹائیڈ بھی کہیں موجود ہیں اور ان کو مجتمع کرنے والے تمام پیچیدہ مالیکیول اور خامرے (enzymes) بھی سب مہیا کر دیے گئے ہیں تو ان نیوکلوٹائیڈ کا خاطر خواہ sequence میں ترتیب پا جانے کا امکان 10^{600} میں سے ایک بار ہے، یعنی ڈی این اے کے خود بخود وجود میں آ جانے کی probability 10^{600} میں سے صرف ایک دفعہ کی ہے۔ ناممکن کہیں تو کم ہے۔

فرانسس کرک (Francis Crick) کو ڈی این اے کی ریسرچ پر نوبل انعام سے نوازا گیا۔ یہ خود بڑا پکا حامی ارتقا تھا مگر کہتا ہے کہ: ''ایک انصاف پسند انسان، اس معلومات کی روشنی میں جواب تک ہمارے پاس ہے، صرف اتنا کہہ سکتا ہے کہ ایک خاص معنی ہیں، انسانی زندگی کی ابتدا اس وقت تو ایک کرشمہ ہی معلوم ہوتی ہے''۔

خیال رہے کہ بچوں میں (Haemophilia Leukemia) ڈی این اے کے کوڈ میں خرابی واقع ہو جانے سے ہوتا ہے۔ کینسر کی تمام قسمیں اسی نازک توازن کے بگڑ جانے سے ہوتی ہیں۔ یہ خرابی کسی بھی ایک ڈی این اے کے کسی ایک اساسی جوڑے میں توازن نہ ہونے سے ہو جاتی ہے۔ یہ خرابی A، T، G، C حروف میں مثلاً ایک بلین ۶۱۸ ملین ۴۵۷ ہزار اور ۶۳۲ ویں اساسی جوڑوں میں ہو سکتی ہے۔ اتنی کثیر تعداد میں اساسی جوڑے، ہر خلیے میں ڈی این اے اور تمام ٹوٹتے بنتے اور تقسیم در تقسیم ہوتے خلیوں میں توازن برقرار رکھنے کا نظام بھی ڈی این اے کے کوڈ میں چھپا ہوتا ہے۔

ڈی این اے کا اپنی نقل بنانے کا عمل

ڈی این اے کی تحیر خیز دنیا میں اپنی ہی نقل یا خودساختہ نقشِ ثانی بنانے (self replication) کا عمل انتہائی تیزی سے جاری رہتا ہے، سب جانتے ہیں کہ انسانی جسم کی ابتدا ماں کے پیٹ میں ایک خلیے سے ہوتی ہے۔ پھر یہ خلیہ تقسیم ہو جاتا ہے اور نئے خلیے وجود میں آتے

جاتے ہیں جو کہ ایک سے دو، دو سے چار، اور اسی طرح ۴-۸، ۱۶-۳۲، ۶۴-۱۲۸ کی نسبت سے تقسیم ہو کر جنم لیتے جاتے ہیں۔

خلیہ تقسیم ہو کر دوسرا خلیہ بناتا ہے اور ہر خلیے کو ایک ڈی این اے چاہیے اور ڈی این اے کڑی خلیے میں ایک ہی ہوتی ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہر تقسیم ہوتا ہوا خلیہ اپنا ہم شکل خود پیدا کرتا ہے۔ ہر خلیہ ایک خاص سائز کا ہوتا ہے۔ تقسیم ہو کر دوسرا خلیہ بنانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ خلیے میں شعور اور یہ ایقان کہاں سے آیا، خلیے کے ساتھ ساتھ ڈی این اے کی تقسیم کا خفیہ عمل بڑے دل چسپ طریقے پر ہوتا جاتا ہے۔

ڈی این اے کا مالیکیول جو شکل میں ایک چکردار زینے کی طرح ہوتا ہے تقسیم ہو کر دو حصوں میں zip کی طرح کھل جاتا ہے۔ یہ دونوں طرف سے غائب ادھورے حصے اسی اطراف میں موجود مادہ سے اپنی انوکھی تکمیل کو پہنچتے ہیں اور ایک سے دوسرا ڈی این اے وجود میں آجاتا ہے۔ تقسیم کے ہر دور میں خاص پروٹین اور خامرہ کسی ماہر روبوٹ (robot) کی طرح کام کرتے رہتے ہیں۔ تمام تفصیل کا ذکر ممکن ہے مگر اس کے لیے بہت سے صفحات بھی ناکافی ہوں گے۔

خامرے (enzymes) وہ کارندے ہیں جو ہر قدم پر یہ چیک کرتے ہیں کہ کوئی غلطی اگر ہوگئی ہے تو فوری طور پر اس کی اصلاح ہو جائے۔ ہر منٹ میں ۳ہزار اساسی جوڑے پیدا ہو جاتے ہیں اور نگرانی کرنے والے خامرے ضروری ترمیم، اصلاح اور ردوبدل بھی کرتے جاتے ہیں تاکہ نئے پیدا ہوئے ڈی این اے میں غلطی کا امکان نہ رہے۔ اس لیے ڈی این اے کے حکم سے مرمت کر سکنے والے زیادہ خامرے پیدا ہوتے ہیں۔ گویا ڈی این اے میں خود اپنی حفاظت کا، اپنی افزایشِ نسل کا اور نسلوں کو محفوظ اور برقرار رکھنے کا مکمل پروگرام کوڈ کیا ہوا ہوتا ہے۔

اب دیکھیے کہ خلیے پیدا ہوتے ہیں اور مرتے جاتے ہیں۔ آپ کے جسم میں جو خلیے چھے ماہ پہلے تھے ان میں سے آج ایک بھی باقی نہیں ہے۔ ان کی عمر بہت کم ہوتی ہے، میرے سب خلیے مر چکے ہیں مگر میں زندہ ہوں اس لیے کہ ہر خلیے نے بروقت اپنا ہمزاد پیدا کرنے کا عمل مکمل کر لیا تھا۔ یہ عمل انتہائی مہارت سے مکمل ہوتا ہے کہ کسی غلطی کا امکان ۳ بلین اساسی جوڑوں میں سے صرف ایک میں ہو سکتا ہے اور یہ غلطی بھی بڑے اعلیٰ تکنیکی انداز میں سنوار دی جاتی ہے۔

سب سے زیادہ دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ خامرے جو پل پل ٹوٹتے بنتے بکھرتے اور سنورتے ڈی این اے کو پیدا کرنے کی ذمہ داری نبھاتے ہیں وہ دراصل مختلف قسم کی پروٹین ہیں جن کے پیدا ہونے کی ترتیب اور سلسلہ بھی اسی ڈی این اے میں کوڈ کیا ہوا ہے اور اسی ڈی این اے کے حکم کے تابع ان کا نظام عمل چلتا ہے جس کی افزائش کی دیکھ بھال ان کو کرنی ہے ۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

فلسفہ ارتقا کہتا ہے کہ انسان درجہ بہ درجہ کچھ فائدہ مند اتفاقات کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ خامرے اور ڈی این اے کا بیک وقت وجود میں آتے جانا اور ان کا انوکھا تال میل کسی بڑے تخلیق کار (Creator) کا کارنامہ ہے اور وہ ہستی اللہ کی ہے، دنیا بھر کے دانش ور یہ حقیقت جانتے جارہے ہیں۔

سائنس کے پاس جواب نہیں ہے کہ ڈی این اے میں یہ معلومات کہاں سے آئیں، ہر زندہ شے، مچھلی، کیڑے مکوڑے، چرند و پرند اور انسان کے ڈی این اے مختلف کیوں ہوتے ہیں، خود ڈی این اے کا وجود اور ابتدا کیسے ہوئی۔ اس عمل کو سمجھنے کے لیے آر این اے کی ایک علیحدہ دنیا کا پتا چلا کہ خامرے کو آر این اے چلاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

خلاصہ یہ کہ زندگی دینے والے عناصر درعناصر مالیکیول، خلیہ، ڈی این اے، آر این اے، خامروں اور ہزاروں پروٹین سب جمع کر لیے جائیں تو بھی زندگی نہیں ملتی۔ تھک ہار کر ماننا پڑتا ہے کہ زندگی صرف تخلیق (creation) کے ذریعے ممکن ہے اور یہ خالق (Creator) کون ہے؟

اللہ تعالیٰ ہی معبود برحق ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں...... وہ اس کے علم میں سے کسی کا احاطہ نہیں کرسکتے مگر جتنا وہ چاہے...... وہ بہت بلند اور بہت بڑا ہے"۔(البقرہ ۲:۲۵۵)۔(بہ شکریہ ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ، نومبر ۲۰۰۷ء)

شیخ فرغلی شہیدؒ: زندگی سے کچھ سبق

عبدالحلیم الکنانی / ترجمہ: محمد ظہیرالدین بھٹی

شیخ محمد فرغلی شہیدؒ کا شمار اخوان المسلمون مصر کے اولین قائدین میں ہوتا ہے۔ آپ عالم و مجاہد اور ایک مثالی داعی تھے۔ آپ کی پوری زندگی جہدِ مسلسل کا مظہر تھی اور شہادت پا کر حیاتِ جاوداں پائی۔ آپ اخوان کے ان اولیں چھے شہدا میں سے ہیں جنھیں جمال عبدالناصر کے ابتدائی دور میں شہید کیا گیا۔ آپ کی زندگی میں ایسے پہلو بھی ملتے ہیں جن میں کارِ انبیاؑ اور تحریک اسلامی کے مشن کو آگے بڑھانے والے داعیانِ اسلام کے لیے تزکیہ و تربیت اور رہنمائی کا سامان ہے۔ فرغلی شہیدؒ عمر بھر ان اصولوں کی پاس داری کرتے رہے حتیٰ کہ راہِ خدا میں اپنا خون دے کر صبر و استقامت اور عزیمت کی ایک عظیم تاریخ رقم کی۔

○ **اسلام کے لیے پہل**: جامعہ ازہر میں دورانِ تعلیم ہی' آپ تک غلبہ دین اور احیاے اسلام کی جدوجہد کی دعوت پہنچی۔ آپ نے کسی بھی رکاوٹ اور دشواری کو خاطر میں لائے بغیر اس دعوت پر لبیک کہا اور اس راہ میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ وہ اس اصول کا عملی نمونہ تھے کہ اسلام کی دعوت کو آگے بڑھ کر صرف قبول ہی نہ کیا جائے بلکہ آگے بڑھ کر کام کیا جائے۔ وہ پہلے پہل قاہرہ کی جمعیۃ الحضارۃ الاسلامیۃ کے رکن تھے۔ اِس تنظیم کو جب یہ یقین ہوگیا کہ الگ الگ کام کرنے سے بہتر یہ ہے کہ یک جا ہو کر کام کیا جائے تو بالآخر یہ اخوان المسلمون میں شامل ہوگئی۔ فرغلی شہیدؒ اس ابتدائی دور میں تحریک کے نمایاں داعیوں میں شمار ہوتے تھے۔

○ **نرم دمِ گفتگو ، گرم دمِ جستجو:** آپ نے احیاے اسلام کے لیے متعین و منظم جدوجہد اور یکسوئی پر بہت سے مضامین لکھے۔ اپنے ایک مختصر مضمون میں وہ لکھتے ہیں: ہم ہمیشہ کام کرنا پسند کرتے ہیں' ہمیں عمل کی دعوت دینا بھی مرغوب ہے' اس لیے کہ عمل ہی مقصد تک پہنچنے کا واحد راستہ ہے' عمل سے ہی ہماری تمام آرزوئیں پوری ہوسکتی ہیں۔ اچھا عمل ہی مکمل خیر ہے' خواہ تھوڑا ہو یا بہت۔ گفتگو جتنی کم ہو اتنی ہی مفید ہے۔ لمبی گفتگو کو سامعین یاد نہیں رکھ سکتے' جب کہ متکلم بھی یکسو نہیں رہتا۔ لہٰذا میں اخوان کے وعظ و ارشاد اور خطاب کرنے والے حضرات سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنی تقریروں اور خطبوں کو مختصر رکھا کریں۔ سامعین اگر تھوڑا سنیں' اسے سمجھ کر عمل کریں تو یہ بہتر ہے۔ مقرر کا اپنی تقریر پر فخر کرنا یا جو کچھ بھی دل میں ہو' اُسے بیان کر دینا مفید نہیں ہے کیونکہ سامعین سب کچھ یاد نہیں رکھ سکتے۔ لہٰذا طویل بیان حکمتِ تبلیغ کے منافی ہے۔

○ **عزتِ نفس اور جراَت:** الاستاذ حسن البناؒ اپنی یادداشتوں میں بیان کرتے ہیں: ''الجباسات البلاح کمپنی کے ذمہ دار حضرات نے اسماعیلیہ کی الاخوان سے درخواست کی کہ وہ اپنی جماعت کا کوئی عالمِ دین متعین کریں جو کمپنی کی مسجد میں امامت و خطابت کے فرائض سرانجام دے۔ چنانچہ استاذ فرغلیؒ کو یہ ذمہ داری سونپ دی گئی۔ ان کی امامت و خطابت اور دروسِ قرآن نے کمپنی کے کارکنوں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ چند ہی ہفتوں بعد کمپنی کے ملازمین میں واضح تبدیلی محسوس کی جانے لگی اور ان کا سماجی شعور بہت بلند ہوگیا۔ مگر کمپنی مالکان کو یہ بات پسند نہ آئی۔ انھوں نے یہ سمجھا کہ اگر یہی حال رہا تو یہ مولانا صاحب کمپنی پر حاوی ہوجائیں گے۔ اس کے بعد کسی کے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ ان کی جدوجہد کو روک سکے' نہ ہی کمپنی ملازمین کو کنٹرول کرنا ہمارے بس میں رہے گا۔ کمپنی کے سرکردہ لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس طاقت ور عالم دین کو مسجد کے فرائض سے سبک دوش کر دیا جائے۔ شیخ فرغلیؒ کو ایک اعلیٰ افسر نے بلا کر کہا کہ: ''مجھے ڈائرکٹر صاحب نے ہدایت کی ہے کہ ہماری کمپنی کو آپ کی خدمات کی مزید ضرورت نہیں اور کمپنی ہی کے کسی ملازم کو آپ کی جگہ پر متعین کرنے کا فیصلہ ہوا ہے۔ ڈائرکٹر صاحب کے حکم کے مطابق یہ ہیں آپ کے اب تک کے بقایا جات''۔

یہ سن کر شیخ فرغلیؒ نے بڑے سکون سے جواب دیا: ''موسیو فرانسو! میں نے کبھی یہ سوچا بھی

نہیں تھا کہ میں الجباسات البلاح کمپنی کا ملازم ہوں۔ اگر میں نے ایسا سمجھا ہوتا تو میں کبھی اس کے ساتھ کام کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوتا۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں اسماعیلیہ کی اخوان المسلمون کا ملازم ہوں۔ میں آپ کے بجاے ان سے تنخواہ کا مطالبہ کروں گا۔ مجھے اگر یہ کام چھوڑنا ہوا تو ان سے بات کر کے چھوڑ دوں گا۔ یہ معاملہ چونکہ آپ سے غیر متعلق ہے لہٰذا میں آپ سے تنخواہ قبول کرتا ہوں نہ بقایا جات لیتا ہوں۔ نہ ہی میں مسجد میں اپنی خدمت کو ترک کروں گا خواہ آپ اس کے لیے طاقت ہی کیوں نہ استعمال کریں۔ ہاں جس جماعت نے مجھے یہاں بھیجا ہے اگر اس کا سربراہ مجھے حکم دے تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ وہ صاحب اسماعیلیہ میں موجود ہیں۔ آپ ان سے بات کرلیں۔

کمپنی کے لوگ بڑے حیران اور پریشان ہوئے۔ انھوں نے چند روز تک صبر کیا کہ شاید شیخ فرغلیؒ ان سے تنخواہ مانگیں گے۔ مگر شیخ نے اسماعیلیہ میں راقم الحروف سے رابطہ کیا۔ ہم نے انھیں کہا کہ وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہیں اور کسی بھی صورت میں اپنی جگہ نہ چھوڑیں۔ شیخ فرغلیؒ کا موقف درست تھا، اس لیے وہ کمپنی کے ملازم تھے، نہ ان سے تنخواہ لیتے تھے۔ مجبور ہوکر اس کمپنی کی انتظامیہ نے پولیس سے مدد مانگی۔ کمپنی کے ڈائرکٹر 'موسیو ماینو' نے کینال کے منتظم اعلیٰ سے رابطہ کیا' اُس نے اسماعیلیہ کے اعلیٰ پولیس افسر کو حکم دیا کہ وہ اس مہم سے عہدہ برآ ہونے کے لیے طاقت کا استعمال کرے، چنانچہ اعلیٰ پولیس افسر' پولیس کی نفری سمیت فیکٹری کے ڈائرکٹر کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں سے اُس نے شیخ فرغلیؒ کو طلب کیا۔ آپ مسجد میں تھے۔ آپ نے قاصد کو کہا: مجھے نہ تو پولیس افسر سے ملنے کی ضرورت ہے نہ ڈائرکٹر سے۔ میرا کام تو مسجد میں ہوتا ہے۔ اگر کوئی مجھ سے ملنا چاہتا ہے تو وہ میرے پاس آجائے''۔ یہ جواب سن کر پولیس افسر آپ کے پاس آیا اور آپ سے کہنے لگا کہ آپ ڈائرکٹر کی بات مان لیجیے اور یہاں کا کام چھوڑ کر واپس اسماعیلیہ چلے جایئے۔ شیخ فرغلیؒ نے وہی جواب دیا جو وہ ڈائرکٹر کو اِس سے پہلے دے چکے تھے۔

جب یہ خبر کمپنی کے کارکنوں تک پہنچی کہ شیخ فرغلیؒ کو مسجد کی امامت و خطابت سے معزول کرنے کی کوشش ہورہی ہے تو انھوں نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر ہڑتال کردی۔ انھوں نے جلوس نکالا اور جوش و جذبے سے معمور ہوکر شیخ کے حق میں نعرے لگائے۔ پولیس افسر نے جب یہ محسوس کیا

کہ طاقت کا استعمال خطرناک ہوگا تو وہ فوراً وہاں سے اسماعیلیہ چلا گیا۔ یہاں اُس نے مجھ سے رابطہ کیا تاکہ اس مسئلے کا کوئی حل نکل آئے۔ بعد میں، میں نے کمپنی کے ڈائرکٹر سے ملاقات کی اور پوچھا کہ وہ کیوں شیخ کو ہٹانا چاہتے ہیں تو اُس کے پاس اِس کے سوا کوئی جواب نہ تھا کہ وہ کوئی ایسا فرد چاہتے ہیں جو ان کی بات مانے۔ اس ڈائرکٹر کی ایک بات مجھے اب تک یاد ہے: ''بہت سے مسلمان قائدین کے ساتھ میری دوستی ہے۔ میں نے الجزائر میں ۲۰ سال گزارے ہیں، مگر مجھے شیخ فرغلیؒ جیسا شخص کبھی نہیں ملا۔ یہ شیخ تو یہاں ہم پر اس طرح حکم چلاتا ہے جیسے یہ کوئی فوجی جرنیل ہو''۔

○ **بلا تاخیر جہاد بالمال:** ۱۹۳۸ء میں الدعوہ حصص پروجیکٹ تجویز ہوا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اخوان میں سے جو چاہے رضاکارانہ طور پر اپنا کچھ مال ---- جو اس کے کل مال کے دسویں حصے سے کم نہ ہو ---- پیش کرے، تاکہ اس جمع شدہ مال کو دعوتی کاموں پر خرچ کیا جاسکے۔ اخوان نے اس مالی جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پورے مصر میں اسماعیلیہ کے اخوان نے اس معاملے میں پہل کی۔ ان میں سرفہرست شیخ محمد فرغلیؒ تھے۔

○ **ثابت قدمی اور غیرمعمولی صبر:** برادر عبداللہ عبدالمطلب مازنی نے رسالہ النذیر (اشاعت یکم اگست ۱۹۳۸ء) میں لکھا: ''پورٹ سعید میں منعقدہ محفل کے دوران ایک اخوانی نے شیخ فرغلیؒ کو ایک ٹیلی گرام دیا۔ شیخ نے اسے پورے اطمینان سے پڑھا، اور جیب میں ڈال لیا۔ چند لمحوں بعد انھیں خطاب کرنے کی دعوت دی گئی۔ ان کی تقریر کا موضوع تھا: ''دعوت اور اس کی پاکیزگی''۔ تقریر موزوں و برمحل تھی۔ اگلے روز المرشد نے ہمیں دورانِ سفر بتایا کہ اس ٹیلی گرام میں شیخ فرغلیؒ کے اکلوتے بیٹے کی وفات کی خبر تھی۔ کیا ایمان ہے اور کتنا مضبوط و صابر ہے یہ دل''۔

○ **سنجیدگی اور احساسِ ذمہ داری:** الاستاذ حسن البنا ۱۹۴۸ء میں اسماعیلیہ میں تشریف لائے۔ وہاں آپ نے رات کو کچھ دیر کے لیے شیخ فرغلیؒ سے ملاقات کی۔ شیخ فرغلیؒ فلسطین کے میدانِ جنگ کی طرف جانے کے لیے بالکل تیار تھے۔ امام البنا نے ان سے کہا: آپ فجر کے بعد سفر کیجیے اور یہ رات ہمارے ساتھ رہیے''۔ مگر شیخ فرغلیؒ راتوں رات ہی جہاد کے لیے فلسطین کے سفر پر روانہ ہوگئے۔ صبح جب امام البنا کو بتایا گیا تو وہ خوش ہوکر فرماتے تھے۔ ''ذمہ دار مسلمان ایسے ہی ہوتے ہیں''۔

○ **ادب و تواضع:** اخوان بتاتے ہیں کہ ایک روز شیخ فرغلیؒ کو استاد البنا کی موجودگی میں تقریر کرنے کی دعوت دی گئی۔ امام البنا نے بھی بہت اصرار کیا کہ وہ تقریر کریں۔ اصرار کے بعد انکار تو نہ کرسکے اور کھڑے ہوگئے مگر چپ چاپ۔ اپنے ہونٹ بالکل نہ کھولے، حالانکہ وعظ و خطاب میں وہ بے مثال تھے۔ وہ امام البنا کے سامنے تقریر کرنے سے شرماتے تھے۔ دراصل یہ ان کا ادب و تواضع تھا۔

○ **دعوت کے ساتھ کامل وفاداری اور احترامِ قیادت:** استاد کامل الشریف بیان کرتے ہیں: ''جب حسن الہضیبی نئے مرشد عام مقرر ہوئے تو مجھے یاد ہے کہ شیخ فرغلیؒ ابتدائی دنوں میں ان کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ نہ تھے۔ ۱۹۵۲ء میں فوجی انقلاب کی کامیابی، یعنی محمد نجیب کی پہلی وزارت کی تشکیل کے بعد، جمال عبدالناصر کے دفتر میں ایک اجلاس منعقد ہوا۔ شیخ فرغلیؒ اور راقم اس اجلاس میں اخوان کی نمایندگی کر رہے تھے۔ انقلابی حکومت اور اخوان کے مابین کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ اس اجلاس میں شرکت کا مقصد، ان غلط فہمیوں کو دُور کرنا تھا۔ انقلابی حکومت، مرشدِ عام اور شیخ فرغلیؒ کے مابین اختلاف ڈالنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اجلاس کے دوران انقلابیوں نے شیخ کی تعریف شروع کر دی اور فلسطین میں ان کے کارناموں کو بیان کرنے کے بعد، مرشدعام پر تنقید کرنے لگے تو شیخ نے فوراً ان کی بات کاٹ دی اور غضب ناک ہوکر کہا: آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس شخص کے بارے میں آپ اس طرح کی باتیں کر رہے ہیں وہ ہمارا لیڈر ہے اور ہماری جماعت کا سربراہ ہے۔ میں آپ کی ان باتوں کو پوری جماعت کی توہین سمجھتا ہوں اور خاص طور پر اپنی اہانت گردانتا ہوں۔ اگر اختلافات دُور کرنے کا آپ کا یہی طریقہ ہے تو پھر آپ اختلافات بڑھائیں گے، کم نہیں کرسکیں گے۔ شیخ کی یہ بات انقلابی فوجی افسروں کو یہ باور کرانے کے لیے کافی تھی کہ ان کے سامنے ایک پُرعزم جواں بیٹھا ہے۔ چنانچہ انھوں نے بات کا رخ دوسری طرف پھیر دیا''۔

○ **اللہ پر یقین و اعتماد:** شیخ فرغلیؒ کی زندگی توکل علی اللہ اور خدا کی ذات پر کامل بھروسے کی آئینہ دار تھی۔ اس کی ایک عظیم مثال اس وقت دیکھنے میں آئی جب وہ دسمبر ۱۹۵۴ء کو پھانسی گھاٹ کی طرف بڑھے تو اللہ پر یقین و اعتماد اُن کے پُرسکون اور پُروقار چہرے سے عیاں تھا۔

عالمی صحافت نے اس وقت کی ان کی حالت کو ان لفظوں میں بیان کیا: ''انتہائی سکون، یقین و اعتماد کی حالت میں''۔ ان کی زبان پر صرف یہی کلمات جاری تھے: ''میں موت کے لیے تیار ہوں۔ اللہ سے ملاقات کو خوش آمدید''۔

○ حقیقی زہد و ورع: شیخ فرغلی شہیدؒ کے زہد و تقویٰ اور دنیا سے بے نیازی کے متعلق محمد عبداللہ الخطیب بیان کرتے ہیں: شہید فرغلیؒ کی سزاے موت کے تین دن بعد کی بات ہے کہ اخبار الاھرام نے اپنے پہلے صفحے پر ایک بہت بڑی عمارت کی تصویر شائع کی۔ اس کے سامنے ایک مرسڈیز کار کھڑی تھی۔ نیچے یہ عبارت لکھی: یہ فرغلی کا گھر ہے، یہ اس کی کار ہے۔ یہ سب کچھ اس نے فلسطین کے لیے دیے جانے والے چندے سے بنایا''۔ ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ حکومت اور اخبار کی انتظامیہ اتنی گھٹیا حرکت بھی کرسکتی ہے۔ میں الحلمیہ میں رہتا ہوں۔ میں نے اخبار لیا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ دکھ اور غم سے میں نڈھال تھا۔ میرے ساتھ الاسیوط کا ایک بھائی رہتا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ تھوڑی دیر کے بعد شیخ فرغلی شہیدؒ کا بھائی ابراہیم ہمیں ملنے آرہا ہے، کیونکہ یہ لوگ یہاں شیخ کی وصیّت اور ان کے کپڑے لینے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ میں شہید کے بھائی اور دیگر اعزا کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ حضرات پہنچ گئے تو میں نے شہید کے بھائی ابراہیم سے وصیّت نامہ لے کر پڑھا تو اس میں یہ بات بھی لکھی تھی: ابراہیم! یاد رکھیے کہ مومن کے لیے قید خانہ، خلوت اور اسے ملک یا شہر بدر کرنا اس کی سیاحت اور اس کا قتل، شہادت ہے۔ اے ابراہیم! میں نے آپ لوگوں کے لیے کچھ نہیں چھوڑا، اگر مال کی ضرورت پڑے تو الشیخ الباقوری کے پاس چلے جانا۔ وہ میرے دوست ہیں۔ وہ آپ کی حاجت کو پورا کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں--- جس شخص کی یہ وصیّت ہو اُس کے بارے میں حکومت کا پروپیگنڈا ایک اوچھی حرکت کے سوا کچھ نہیں۔ (المجتمع، شمارہ ۱۶۳۲)

مرچ مسالے دار مرغّن غذا

نظامِ ہضم کی خرابی کا باعث بن سکتی ہے



نئی کارمینا لیجیے، یہ آپ کو بدہضمی، قبض، گیس، سینے کی جلن
اور تیزابیت سے محفوظ رکھے گی۔



نئی کارمینا

ہاضم ٹکیاں، ہر گھر کی اہم ضرورت

ہمدرد

ہمدرد کے متعلق مزید معلومات کے لیے ویب سائٹ ملاحظہ کیجیے:
www.hamdard.com.pk

مدینۃ الحکمۃ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ۔

آپ ہمدرد دوست ہیں۔ اعتماد کے ساتھ مصنوعاتِ ہمدرد خریدتے ہیں۔ جائز منافع
شہرِ علم و حکمت کی تعمیر میں لگ رہا ہے۔ اس کی تعمیر میں آپ بھی شریک ہیں۔

Adarts-CAR-1/2005

قاضی گروپ آف کمپنیز

تعارف:۔

قاضی گروپ آف کمپنیز کی تاریخ گزشتہ کئی برس پر محیط ہے۔گروپ کے چیئرمین نے کئی سال قبل پراپرٹی اور رئیل اسٹیٹ کے شعبہ میں قاضی انٹرپرائزز کے نام سے کاروبار کا آغاز کیا۔شبانہ روز کی انتھک محنت، دیانتداری، جذبہ اخلاص اور اللہ تعالی کے فضل وکرم سے یہ ایک مستحکم اور قابل اعتماد ادارہ کی شکل اختیار کر چکا ہے۔الحمداللہ قاضی انٹرپرائزز کو اب تک کئی منصوبے مکمل کرنے کا اعزاز حاصل ہے جہاں ممبران یا تو رہائش پذیر ہیں یا اپنے مکان /فلیٹ فروخت کر کے کئی گنا منافع کما چکے ہیں۔قاضی انٹرپرائزز کے رہائشی منصوبہ جات جو مکمل اور آباد ہو چکے ہیں ان میں الرحمٰن ٹاؤن، پاسبان ٹاؤن، گلستان راشد، فیملی اپارٹمنٹس مری اور جو زیر تعمیر ہیں ان میں کوہسار سٹی مری، موٹروے سٹی، شفاء گارڈن اسلام آباد، قطبال ٹاؤن اسلام آباد، حمیدہ ٹیرس، اسلام آباد ہل گارڈن شامل ہیں۔ قاضی گروپ آف کمپنیز کے دیگر اداروں میں قاضی کنسٹرکشن کمپنی، ایچ ایس ٹریڈنگ پرائیویٹ لمیٹڈ قاضی ہاؤسنگ پرائیویٹ لمیٹڈ، ایک بزنس میگزین پندرہ روزہ مستقبل اور فلاحی ادارہ حق ٹرسٹ شامل ہیں۔

حق ٹرسٹ

حق ٹرسٹ کے تحت مستحقین کی فلاح و بہبود، یتیم بچیوں کی شادی، غریب طلبا کی تعلیم، دینی مدارس کی خدمات، غریب مریضوں کے علاج، چھوٹے کاروبار شروع کرنے کے لیے بلا سود قرض وغیرہ فراہم کرتے ہیں۔اس کے علاوہ ملک میں کسی بھی قسم کے ہنگامی حالات مثلاً زلزلہ اور سیلاب وغیرہ میں متاثرین کی امداد وغیرہ بھی کی جاتی ہے۔

پندرہ روزہ مستقبل میگزین:

یہ معاشی اور کاروباری نوعیت کا ایک منفرد میگزین ہے جو پاکستانی نوجوانوں کو پاکستان میں رہ کر کم سرمایہ سے اپنا ذاتی کاروبار شروع کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور ملک کی معاشی اور تجارتی صورتحال سے قارئین کو باخبر رکھتا ہے۔

ایچ ایس ٹریڈنگ پرائیویٹ لمیٹڈ:

یہ ادارہ موٹر سائیکل اور ہر قسم کے الیکٹرانکس کے سامان کی فروخت نقد اور آسان اقساط پر کرتا ہے۔اس شعبہ میں جو مختلف ذیلی ادارے اور برانچیں کام کر رہی ہیں ان میں ایچ ایس ٹریڈرز راولپنڈی و اسلام آباد، HS ٹریڈرز میانوالی، HS ٹریڈرز دولتالہ، قاضی انٹرپرائزز کوہاٹ، فرینڈز الیکٹرانکس چکوال، قاضی مارکیٹنگ مظفر آباد شامل ہیں۔

کتاب نما

سیرتِ رحمت عالم ﷺ، ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری۔ مترجم: خدابخش کلیار۔ ناشر: نشریات، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۸۵۶۔ قیمت: ۴۵۰ روپے۔

رحمت عالم خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی تمام صفات وکمالات کی جامع اور انسانیت کی معراجِ کمال ہے ع آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت نگاری ایک ایسا پاکیزہ موضوع ہے جس پر ہر مکتبِ فکر کے اہلِ قلم گذشتہ چودہ صدیوں میں نہایت وقیع اور قابلِ قدر تصانیف پیش کر چکے ہیں۔ زیرنظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ مدینہ منورہ کے ایک فاضل محقق ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری کی کاوشِ فکر وتحقیق کا نتیجہ ہے۔ اصل کتاب السيرة النبويه الصحيحة کے نام سے عربی زبان میں ہے۔ اسے محترم خدابخش کلیار نے اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ کتاب چار فصلوں پر مشتمل ہے جن کے عنوانات یہ ہیں: رسولؐ اللہ مکہ میں، رسولؐ اللہ مدینہ میں، مشرکین کے خلاف جہاد، رسالت اور رسولؐ۔

فاضل مصنف نے جہاں یہ خیال رکھا ہے کہ موضوع اور ضعیف روایتیں کتاب میں نہ آنے پائیں، وہاں بعض مشہور لیکن مشتبہ روایتوں کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔ انھوں نے حیاتِ نبوی کے مکی اور مدنی دونوں ادوار کے اہم واقعات اختصار مگر جامعیت کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ وہ ان واقعات کے صرف ناقل ہی نہیں بلکہ جگہ جگہ تفکر وتعمق سے کام لے کر قارئین کو بھی سوچنے اور غور کرنے کی دعوت دی ہے، ساتھ ہی سیرتِ نبویؐ سے فکرانگیز نتائج بھی اخذ کیے ہیں۔ اس کتاب میں فاضل مصنف کی ایک اور تصنیف المجتمع فی عهد النبوة کا ایک نظرثانی حصہ بھی شامل ہے۔ اس کے انگریزی ترجمے کا اُردو ترجمہ محترمہ عذرا نسیم فاروقی (م: ۲۰۰۴ء) نے کیا تھا۔ اس سے یقیناً کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ بلاشبہہ زیرتبصرہ کتاب کتبِ سیرت میں گراں قدر اضافہ ہے۔ البتہ یہ کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ مختلف مقامات، غزوات وسرایا

اورافراد کے اسما پر اعراب اور اضافت کی علامات لگانے کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ قارئین کو غلط تلفظ سے بچانے کے لیے ایسا اہتمام کرنا بہت ضروری ہے۔ (طالب الہاشمی)

احیاے دین کا مقدمہ، سردار عالم خان۔ ناشر: الفیصل، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۲۳۹۔ قیمت: ۱۸۰ روپے۔

زیرنظر کتاب میں قیامِ پاکستان کا مقصد، اسلام اور مغرب، قوموں کا عروج و زوال، تجدید و احیاے دین اور احیاے خلافت جیسے اہم موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

آغاز میں قیامِ پاکستان کے مقاصد، تحریکِ پاکستان میں مختلف لوگوں کے کردار اور نفاذ اسلام کی راہ میں حائل رکاوٹوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قائداعظم اور لیاقت علی خان کی تقاریر سے اقتباسات پیش کر کے ان لوگوں کا موقف غلط ثابت کیا گیا ہے جن کو یہ وہم ہوگیا ہے کہ قائداعظم پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں مؤلف نے قیادت کے بحران، دینی قوتوں کے انتشار اور نوآبادیاتی ورثے کو نفاذ اسلام کی راہ میں رکاوٹیں قرار دیا ہے۔

اسلام اور مغرب کے تعلقات کے تحت ساتویں صدی عیسوی سے لے کر اب تک کی تاریخ بیان کی گئی ہے جس میں صلیبی جنگوں، مغربی استعماریت، نوآبادیاتی نظام اور موجودہ صورت حال کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ مغرب اپنے ممالک میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور دنیا بھر میں اسلام کے تیزی سے پھیلتے ہوئے اثرات سے خوف زدہ ہے۔ (ص ۱۳۴)

قوموں کے عروج و زوال کے دائمی اور معروضی اصول بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تجدید و احیاے دین کے زیرعنوان تشکیل معاشرہ کے اصول، اجتہاد کی ضرورت، مجدد کے مقام، تجدید کی ضرورت اور روح پر سیرحاصل بحث کی گئی ہے۔ ۱۹ویں صدی کے عظیم مجدد عثمان فودیو (۱۷۵۴ء-۱۸۱۷ء) کی جدوجہد اور اس کے نتیجے میں سکوٹو (جمہوریہ نائیجیریا) میں خلافت کے قیام کا شان دار تذکرہ بھی سامنے آتا ہے۔ کتاب مسلمانوں کو اقامت دین کی جدوجہد پر اُبھارتی ہے۔ (حمیداللہ خٹک)

نام ور مغربی سائنس دان، حمید عسکری۔ ناشر: مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور۔ صفحات: مجلد: ۳۶۰۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔

سائنس وہ علم ہے کہ جس کی بنیاد خیال، مشاہدے اور بالآخر تجربے سے منسوب ہے۔ یہ علم، اللہ کی نشانیوں کو پرکھنے کی انسانی کوشش اور ان کوششوں کے ثمر سے انسانوں کو ثمربار کرنے کا وہ علم ہے جس نے حیرتوں کے باب کھولے اور سہولتوں کے خزانوں کا انبار لگا دیا ہے۔

سائنس کا علم انسانیت کی مشترکہ میراث ہے کہ اس اہرام کی تعمیر میں مختلف اوقات میں معروف اور گم نام اہلِ دانش نے اپنے اپنے حصے کا پتھر نصب کیا۔ بلاشبہہ ان سائنسی ایجادات کے پس منظر میں مسلمان سائنس دانوں کی کاوشوں، تحقیقات اور تجربات کا بھی حصہ ہے لیکن آخرکار جس ایجاد یا جس سائنسی کلیے کو حل کرنے کا اعزاز جن مغربی سائنس دانوں کو حاصل ہوا، یہ کتاب ان میں سے ۲۵ محسنوں کے احوال پر مشتمل ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے کتنی محنت کی۔ کس قدر بڑے سماجی، معاشی، مذہبی چیلنجوں کا سامنا کیا۔ آج ہم جن آسایشوں کو یوں برت رہے ہیں کہ شاید یہ آفرینش آدم کے عہد سے جوں کی توں میسر تھیں تو واقعہ یہ ہے کہ ایسا نہیں تھا۔ اس کے لیے دنیاے علم کو بڑی مشکلات کو عبور کرنا پڑا ہے۔ فاضل مصنف نے عام فہم انداز میں ان سائنس دانوں کی داستانِ حیات اور کارنامۂ علم کو پیش کیا ہے۔ ان رجال میں: راجر بیکن، گوٹن برگ، ٹرے ویژن، کوپرنیکس، پیراسیل، ٹامیکو براہے، گلیلیو، جان کیپلر، ولیم ہاروے، رابرٹ بوائل، جوشم باشر، لیون ہک، آئزک نیوٹن اور دیگر ۱۲ سائنس دان شامل ہیں۔ اس سے قبل مجلسِ ترقیِ ادب نام ور مسلم سائنس دان بھی شائع کرچکی ہے۔ (سلیم منصور خالد)

تعارف کتب

◉ **قرآن کے بکھرے موتی**، مولانا محمد اصغر کرنالوی۔ زم زم پبلشرز، شاہ زیب سنٹر نزد مقدس مسجد، اُردو بازار، کراچی۔ فون: ۲۷۲۵۶۷۳-۰۲۱۔ صفحات: ۵۷۳۔ قیمت (مجلد): ۲۰۰ روپے۔[قرآن کے عجائب، خزینوں، جواہر اور موتیوں کو جاننے کی سعی اور مطالعہ قرآن کا ذوق بڑھانے کی ایک کوشش۔ ۷۳ تفاسیر اور ۶۵ ہزار صفحات کا نچوڑ، بقول مصنف برسوں کے مطالعے کا نتیجہ۔ عقائد، معاملات، عبادات، جنت، دوزخ،

دعوت اور جہاد کے علاوہ فقہ، قانون، سیاست اور تصوف سے متعلق واقعاتی اسلوب میں دل چسپ معلومات۔ ابواب بندی اور موضوعات کا تعین کیا جاتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔]

◉ **عبادات، فضائل و مسائل**، سراج الدین ندوی۔ ناشر: ملت اکیڈیمی، دہلی۔ ملنے کا پتا: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی-۳۰۷، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵، بھارت۔ صفحات: ۴۲۶۔ قیمت: درج نہیں۔ [نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے بارے میں اہمیت و فضیلت کے مختصر ذکر کے بعد، ضروری فقہی مسائل کا عام فہم اور جامع بیان۔ حنفی مسلک کے ساتھ دوسرے مسلکوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔]

◉ **لکھاری کیسے بنتا ہے؟** امجد جاوید۔ ناشر: علم و عرفان پبلشرز، ۳۴- اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۳۲۳۳۶۔ صفحات: ۱۲۰۔ قیمت: ۱۲۰ روپے۔ [ابلاغ، تحریر، فنِ تحریر کے لوازم، طریقے، اصنافِ نظم و نثر اور آخر میں جمیل جالبی، عابد علی عابد اور سید مودودی کے چند نصائح۔ کتاب کے مصنف نے بتانے کی کوشش کی ہے کہ آپ کیسے لکھاری بن سکتے ہیں (ہمارے خیال میں لفظ لکھاری کے بجاے 'اہلِ قلم' یا 'قلم کار' بہتر معلوم ہوتا ہے)۔ سو باتوں کی ایک بات، قلم کار بننے کا سب سے مؤثر، بہتر اور کامیاب طریقہ 'می نویس و می نویس و می نویس' لکھتے رہیے، لکھتے رہیے، قلم گھستے رہیے، ایک سہانی صبح آپ کا شمار اہلِ قلم میں ہوگا۔ صرف اصول اور ضابطے پڑھنے سے لکھاری نہیں بنتا۔ بہرحال لکھاری بننے کے شائقین کے لیے ایک مفید معاون۔]

◉ **کامیاب طالب علم**، روح اللہ نقش بندی۔ ناشر: دارالھدیٰ، دفتر نمبر ۸، پہلی منزل، شاہ زیب ٹیرس نز دزم زم پبلشرز، اُردو بازار، کراچی۔ صفحات: ۱۹۶۔ قیمت: درج نہیں۔ [ایک طالب علم کن صفات کو اپنا کر علم میں پختگی، عمل میں مضبوطی اور اخلاق میں درستی پیدا کرسکتا ہے۔ طالب علم کے لیے ضروری آداب تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں، نیز علم کے متعلق اکابر کے واقعات نے کتاب کو دل چسپ بنا دیا ہے۔]

◉ **رہنماے خوش خطی**، محمد اسلم زاہد۔ ناشر: مکہ کتاب گھر، الکریم مارکیٹ، حق سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۱۲۴۸۸۲۔ صفحات: ۲۴۸۔ قیمت: ۱۴۰ روپے۔ [نسخ اور نستعلیق سیکھنے سکھانے کے لیے ایک عمدہ کتاب۔ خوش خطی کے اصول اور طریقے، مشق کے لیے نمونے کے الفاظ اور تین تین، چار چار خالی سطریں مشق کے لیے۔ مصنف، سید نفیس رقم کے تربیت یافتہ خوش نویس ہیں مگر تعجب ہے کہ انھوں نے اِملا کی صحت کو نظرانداز کیا ہے۔ اُردو میں لفظ 'اِملا' میں ہمزہ (ء) نہیں ہے۔ طلبا کے بجاے 'طلبہ'، لئے اور لیجئے کے بجاے 'لیے' اور 'لیجیے' صحیح ہے۔ 'پڑھیئے' تو قطعی غلط ہے۔]

◉ **تیرتی قبر؟** ڈاکٹر محمد افتخار کھوکھر۔ ناشر: دارالسلام، ۳۶- لوئر مال، سیکرٹریٹ اسٹاپ، لاہور۔ صفحات: ۵۶۔ قیمت: ۶۵ روپے۔ [چار دوستوں کے مچھلی کے شکار سے شروع ہونے والی کہانی در کہانی میں مچھلیوں کے مشہور قصے، سائنسی معلومات اور قرآن میں ذکر، سب دل نشین انداز سے آ گیا ہے۔ ۸ تا ۱۲ سال تک کی عمر کے بچوں کے لیے ہے۔ تیرتی قبر سے مراد حضرت یونس علیہ السلام کا مچھلی کے پیٹ میں ہونا ہے۔]

مدیر کے نام

محمد شکیل 'ٹوبہ ٹیک سنگھ

'ووٹ کی شرعی حیثیت' (دسمبر ۲۰۰۷ء) ایک اہم مسئلہ ہے۔ پاکستان میں بہت سے لوگ ووٹ کے ذریعے تبدیلی کو کارِلا حاصل اور مغربی طریقہ سمجھتے ہیں۔ راے عامہ ہموار کیے بغیر بزورِ طاقت شریعت نافذ کرنے کی سوچ کبھی 'لال مسجد تحریک' اور کبھی 'تحریکِ نفاذِ شریعت محمدی' کی شکل میں سامنے آرہی ہے۔ نتائج سب کے سامنے ہیں۔ 'مغربی دانش وروں کا احساسِ شکست' (دسمبر ۲۰۰۷ء) میں خوش کُن اور اُمید افزا پہلو سامنے آیا ہے لیکن ناول نگاروں کا مقصد یورپ وامریکا میں خوف وہراس پھیلانا معلوم ہوتا ہے اور راے عامہ کو اِس بات پر آمادہ کرنا کہ اسلامی انقلاب کی تحریک کو ابھی سے کچل ڈالو۔ اِس قسم کی تحریریں اور فلمیں کس قسم کے اثرات مرتب کررہی ہیں اور اسلام کے بارے میں کیا کیا منفی تاثرات پھیلارہی ہیں ان کا مطالعہ وتجزیہ بھی آنا چاہیے۔

ڈاکٹر اختر حسین عزمی 'پتوکی

'ووٹ کی شرعی حیثیت' (دسمبر ۲۰۰۷ء) کے مسئلے پر تاحال اس چیز کی ضرورت ہے کہ تفصیل سے بحث کی جائے۔ اس موضوع پر اجتہادی آرا میں اختلاف ایک فطری امر ہے۔ بایں ہمہ ووٹ کے کلچر یا جمہوری عمل کے موجودہ چلن کی مخالفت کرنے والوں کو گمراہ کن قرار دینا بھی سوچ کا نمایندہ حریت فکر کے منافی ہے۔

شفیق الرحمٰن ہاشمی 'قصور

'اقبال اور جوانانِ ملّت' (دسمبر ۲۰۰۷ء) میں راہِ عمل متعین کرنے کے لیے رہنمائی ہے۔ اس مضمون میں علامہ اقبال کے اکبرالٰہ آبادی کے نام ایک خط کا ذکر کیا گیا ہے جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ کوئی قابل نوجوان جو ذوقِ خداداد کے ساتھ قوتِ عمل بھی رکھتا ہو مل جائے جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کردوں۔ معروف مسلم لیگی رہنما اور کالم نگار م-ش نے ایک موقع پر یہی عبارت نقل کرنے کے بعد لکھا تھا: ''اور وہ نوجوان انھیں مولانا مودودی کی صورت میں مل گیا، جسے انھوں نے لاہور آنے کی دعوت دی''۔

حسین بخش جاکھرانی 'حیدرآباد

'اقبال اور جوانانِ ملت' (دسمبر ۲۰۰۷ء) کے مطالعے سے اقبال کی نوجوانوں سے توقعات اور ان کے لیے پیغام تو سامنے آتا ہے مگر تشنگی باقی رہتی ہے۔ ضرورت ہے کہ عصرِ حاضر میں اقبال کے افکار، شاعری اور نثر سے نوجوانوں کو آگاہ کرنے کے لیے انتخاب پر مبنی ایک جامع، مؤثر اور مختصر کتاب تیار کی جائے۔

فراز احمد سلیم ' گوجرانوالہ

'انسانی وسائل کی ترقی، اسلامی نقطۂ نظر' (دسمبر ۲۰۰۷ء) کے حوالے سے عرض ہے کہ اساتذہ کرام دورانِ تدریس سیرت سازی کو پیش نظر رکھیں تو نئی نسل کی تربیت کے لیے مزید راہیں کھل سکتی ہیں۔

صابر حسین ' ہری پور

'جدیدیت، سائنس اور الہامی دانش' (دسمبر ۲۰۰۷ء) میں بہت سے مشکل الفاظ تھے۔ تحریر عام فہم ہونی چاہیے۔ کوشش کیجیے کہ تحریریں عام فہم ہوں اور آسان الفاظ استعمال کیے جائیں۔

شفیق الرحمٰن شاکر ' قصور

'کتاب اللہ کا نفاذ: اہمیت وضرورت' (نومبر ۲۰۰۷ء) میں اُمت مسلمہ کے اہم ترین مقصدِ حیات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ درحقیقت موجودہ دور میں کتاب اللہ کے نفاذ کی راہ میں دو بڑی رکاوٹیں حائل ہیں۔ اوّلاً، جن لوگوں پر کتاب اللہ کے نفاذ کا فریضہ عائد ہوتا ہے وہ محوِ غفلت ہیں اور دو رنگی کا شکار ہیں۔ ثانیاً، عالمی طاقتیں مسلم ممالک کو لادین اور سیکولر بنانے کے عالمی ایجنڈے پر عمل پیرا ہیں اور ان ممالک کے حکمران اُن کے دستِ راست بنے ہوئے ہیں۔

سیمیں نذیر ' کراچی

'ایفاے عہد اور مومنانہ صفت' (نومبر ۲۰۰۷ء) اخلاقی اور عملی پہلو کے حوالے سے اچھی تذکیر ہے۔ 'ازواجِ مطہراتؓ کے اسلوبِ دعوت' سے جذبۂ دعوت وتحریک کو مہمیز ملی اور اک ولولۂ تازہ ملا۔

بشریٰ کنول ' کراچی

نومبر کا شمارہ اول تا آخر پسند آیا خصوصاً 'ازواجِ مطہراتؓ کا اسلوبِ دعوت' (نومبر ۲۰۰۷ء) کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنالیا۔

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی 'علی گڑھ' بھارت

ترجمان القرآن مسلسل باصرہ نواز ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو تا قیامت جاری رکھے۔ بعض مضامین تو بے حد چشم کشا ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے مسلمانوں کو مکمل استفادے کی توفیق عطا فرمائے۔

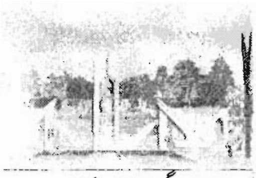
ترجمان القرآن کا اشاریہ (جنوری ۲۰۰۷ء-دسمبر ۲۰۰۷ء) دستیاب ہے۔ خواہش مند قارئین رابطہ کر کے طلب کر سکتے ہیں۔ (ادارہ)

موٹروے سٹی

حکومت سے منظور شدہ واحد منصوبہ
NOC-91N-1/TP/TMA/FJ


مسجد جو تیار ہو چکی ہے

محل وقوع: یہ منصوبہ سرسبز پہاڑوں کی وادی، قدرتی لینڈ سکیپ سے بھرپور، تنازہ ڈیم اور شاہ پور ڈیم جیسے خوبصورت پکنک سپاٹس اور تعمیر ملت ایجوکیشن سٹی سے ملحق، زیر تکمیل نیو اسلام آباد انٹرنیشنل ایئرپورٹ اور پشاور لاہور موٹروے کے وسط میں واقع ہے۔


گیٹ جو بن چکا ہے

ترقیاتی کام: جن فیزوں کی بکنگ مکمل ہو چکی ہے ان میں ترقیاتی کام جاری ہیں۔ پانی کی خوبصورت جھیلیں، مسجد، مین باؤنڈری وال، مین گیٹ اور ارتھ ورک مکمل ہو چکا ہے۔ سڑکوں کا کام جاری ہے۔

قیمت و طریقہ ادائیگی:

موٹروے سٹی ایگزیکٹو بلاک II (بکنگ جاری ہے)

سائز	قیمت زمین	ایڈوانس	ماہانہ قسط
5 مرلے	150000/-	10000/-	1000/-
10 مرلے	300000/-	20000/-	2000/-
20 مرلے	600000/-	40000/-	4000/-

(اس کے علاوہ -/200 روپے فی مرلہ ممبر شپ فیس وصول کی جائے گی)

بنیادی سہولیات و خصوصیات: کشادہ سڑکیں، محفوظ داخلی راستے، نکاسی آب/سیوریج، پانی جیسی نعمت کی فراوانی، ہر فیز میں شاپنگ سینٹر اور مسجد۔

قطبال ٹاؤن اسلام آباد

(بکنگ جاری ہے)

پہلے قبضہ پھر قیمت

یہاں ترقیاتی کام مکمل ہو چکے ہیں اور گھروں کی تعمیر جاری ہے

محل وقوع: اسلام آباد ہائی وے کے قریب کھنہ ایسٹ میں واقع ہے۔ اسلام آباد ہائی وے کے قریب زیرو پوائنٹ سے صرف چند منٹ اور اسلام آباد ایئرپورٹ سے چند منٹ کی مسافت پر واقع ہے۔

آپ ابھی پلاٹ خریدیں اور فوری گھر بنائیں

پلاٹ سائز: 1250 مربع فٹ، 1500 مربع فٹ، 1750 مربع فٹ
قیمت: -/250,000 روپے فی مرلہ

خصوصیات: یہ منصوبہ جدید سہولیات سے آراستہ ہے جہاں صاف ستھرا آلودگی سے پاک ماحول ہے۔

ایڈریس ہیڈ آفس: **قاضی انٹرپرائزز**

8 جنگ بلڈنگ مری روڈ راولپنڈی

051-5962230 :فیکس U.A.N:111-700-400
ای میل Email: shaukat@isb.comsats.net.pk
ویب سائٹ www.qazi.com.pk

پچاس ہزار کنال رقبہ پر تعمیر ہونے والے شہر قرطبہ سٹی اور اسلام آباد موٹر وے چکری انٹرچینج سے متصل

قرطبہ کارپوریشن کا عظیم الشان رہائشی منصوبہ

تعلیم یافتہ باشعور افراد کی بہترین بستی

قرطبہ کارپوریشن

دار السلام

دار السلام

پہلے سب کو دیکھیں پھر ہم سے خریدیں

قرطبہ سٹی کے قریب واقع تقریباً 30 سوسائٹیوں میں سب سے پہلے 120 فٹ ڈبل سڑک سید مودودی چوک پر واقع



قرطبہ کارپوریشن

تحریک اسلامی سے وابستہ افراد کا قابل اعتماد ادارہ

محل وقوع

- مین ڈبل روڈ پر "سید مودودی چوک" سے متصل۔
- چکری انٹرچینج اور مین چکری بس سٹاپ سے نزدیک ترین۔
- چکری کے منصوبہ کی تقریباً 30 سوسائٹیوں میں آئیڈیل لوکیشن
- اعلیٰ تعلیمی اداروں اور جدید سرکاری ہسپتال سے قریب۔
- مجوزہ انٹرنیشنل ایئرپورٹ سے قریب۔

خصوصیات

- پُرفضا مقام، پُرسکون ماحول اور خوبصورت محل وقوع
- مجوزہ چکری انڈسٹریل اسٹیٹ میں روزگار کے مواقع
- اعلیٰ تعلیمی اداروں، ہسپتالوں اور کاروباری مراکز تک دسترس
- زرخیز اور ہموار سطح اراضی
- جدید سہولتوں سے آراستہ اور ریٹ سب سے کم۔



300 روپے ماہانہ فی مرلہ قسط

ہمارے تکمیل شدہ منصوبے

دار السلام (فیز-1) موٹر وے چوک اسلام آباد
دار السلام ٹی چوک روڈ واہ کینٹ
قرطبہ ٹاؤن (فیز-1) چارسدہ روڈ پشاور

پشاور شہر سے متصل سب سے سستی سکیم متعارف کرانے کا اعزاز بھی قرطبہ کارپوریشن کو حاصل ہے۔ قرطبہ ٹاؤن ریکارڈ مدت دسمبر 2006 میں ایک فیز مکمل بک ہو چکا ہے جبکہ قرطبہ ٹاؤن فیز II کی بکنگ جاری ہے۔

ہمارے زیر تکمیل منصوبے

دار السلام (فیز-II) متصل ترنول پھاٹک اسلام آباد
پاسبان ٹاؤن پشاور
قرطبہ ٹاؤن (فیز-II) پشاور



پلاٹ سائز

سائز پلاٹ 5 مرلہ 10 مرلہ اور ایک کنال **کمرشل پلاٹ** فی یونٹ 2 مرلہ قیمت 3 لاکھ روپے

آسان طریقہ ادائیگی

سائز	کل قیمت	ایڈوانس	ماہانہ قسط
5 مرلے	150,000	15,000	1,500
10 مرلے	300,000	30,000	3,000
1 کنال	600,000	60,000	6,000

نوٹ: یہ قیمت صرف ایک ماہ کے لیے ہے۔ کارنر پلاٹ پر 10% اضافی چارجز۔ اقساط کے مکمل ہونے پر رجسٹری

پچاس فیصد ادائیگی پر صرف دس دن میں رجسٹری اور قبضہ
ٹوٹل ایڈوانس ادائیگی پر 15 فیصد رعایت، ڈبل روڈ اور کارنر پلاٹ پر 10 فیصد زیادہ
تمام رقوم بنام **قرطبہ کارپوریشن** کرنٹ اکاؤنٹ نمبر 79000026-03
حبیب بنک لمیٹڈ رحمان آباد برانچ مری روڈ راولپنڈی روانہ کریں
رجسٹریشن فارم مبلغ دو صد روپے ہیڈ آفس بھجوا کر آج ہی منگوائیں

امریکہ میں بکنگ فارم / بروشر مندرجہ ذیل ایڈریس سے حاصل کر سکتے ہیں

UMAR UMAR ABDUL
824E9 ST # 6 G
BROOKLYN
NY
(917) 821 - 6149
(817) 434 - 4456
Islam Edu medic. com@yahoo.com

قرطبہ کارپوریشن

راولپنڈی آفس
محمد یونس صدیقی (مینیجنگ ڈائریکٹر)
12-B/1 سیکنڈ فلور تاج محل پلازہ بالمقابل مکہ روڈ چوک مری روڈ راولپنڈی
فون: 051-4450320 موبائل 0321-5076010

پشاور آفس
صبیح الرحمٰن یوسفی (ڈائریکٹر)
سیکنڈ فلور حسین پلازہ بالمقابل جناح پارک (نزد فردوس سینما) پشاور
موبائل 0300-5988039/0321-5240933

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

قرطبہ سٹی

امن اور علم کی بستی اکیسویں صدی کا محورِ تعلیم و تحقیق

Madina Tul Ilm



محلِ وقوع و آب و ہوا:

قرطبہ سٹی کے لئے جگہ کا انتخاب چکری انٹرچینج، موٹر وے (M2) کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ جگہ اسلام آباد، راولپنڈی سے 30 منٹ کی ڈرائیو (50 کلومیٹر تقریباً) پر تحصیل راولپنڈی میں واقع ہے۔ کوہِ خیری مُورت کے دامن میں واقع یہ علاقہ قدرتی مناظر سے مالا مال ہے۔ اس کا موسم اور نشیب و فراز اسلام آباد سے ملتے جلتے ہیں۔ اس کے درمیان سے دریائے سِل بل کھاتا ہوا گزرتا ہے جس میں قدرتی چشموں کی وجہ سے سارا سال پانی کا بہاؤ رہتا ہے۔

شہری سہولیات و خصوصیات:

❀ تمام سہولیات جو ایک جدید شہر میں ہوتی ہیں ❀ شجرکاری اور اس کی مستقل دیکھ بھال گھروں کے معیاری نقشہ جات کی فراہمی۔
❀ قرطبہ سٹی کا اندرونی ٹرانسپورٹ کا نظام ❀ قرطبہ سٹی سے اسلام آباد، راولپنڈی تک ٹرانسپورٹ کی سہولت ❀ منصوبے کو آبادکاری کے دوران مالی لحاظ سے خودکفیل رکھنے کا نظام۔
❀ اسلامی معاشرتی اقدار کے فروغ کے لئے شہری زندگی اور ہمسائیگی کے خصوصی بائی لاز ❀ تمام شہری سہولیات کی فراہمی اور مستقل دیکھ بھال کا نظام۔



منصوبے کی خصوصیات:

❀ قرطبہ سٹی کے وسط میں وسیع و عریض بین الاقوامی قرطبہ یونیورسٹی کا قیام و انصرام۔ یہ یونیورسٹی جدید سائنسی اور معاشرتی علوم پر تحقیق اور اُن کو اسلامی قدروں میں ڈھالنے کا محوّر ہوگی۔ ❀ ایک عظیم الشان مرکزی جامع مسجد قرطبہ کا قیام و انصرام۔ یہ جامع مسجد یونیورسٹی سے ملحقہ ہوگی اور یونیورسٹی کے مقاصد کے حصول میں کلیدی کردار کی حامل ہوگی۔ ❀ خواتین کے لئے خصوصی کاروباری مراکز و تفریحی مقامات۔

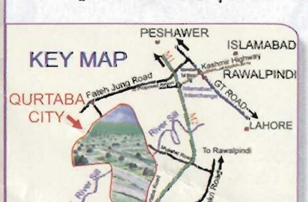
ترقیاتی کاموں کی صورتِ حال اور ماسٹر پلان:

❀ اس عظیم الشان منصوبے کے لیے 4 سے زائد ملحقہ موضع جات میں زمین کی خرید کی جا چکی ہے۔ اِن میں سے ایک موضع کی زمین کو یکجا کیا جا چکا ہے (الحمدُ اللہ)۔ اور بقیہ موضع جات میں یکجا کرنے کا عمل جاری ہے۔ منصوبے کے حجم کے پیش نظر اس کی منصوبہ بندی اور تکنیکی کام مُلک کے مشہور اور مایہ ناز تکنیکی منصوبہ ساز اور کنسلٹنٹ میسرز نیسپاک (نیشنل انجینئرنگ سروسز پاکستان) کو سونپا گیا ہے۔ نیسپاک نے ایک جامع شہری منصوبہ پیش کر دیا ہے۔ اور یکجا ہونے والے وسیع رقبہ کی منصوبہ بندی مکمل کر دی ہے۔ انجینئرز کا تیار کردہ ماسٹر پلان TMA کے پاس منظوری کے لئے جمع کروا دیا گیا ہے۔ اور تکنیکی مرحلوں سے گزر کر اب یہ ماسٹر پلان منظوری کے آخری مرحلہ میں ہے۔



پراجیکٹ آفس اور سائیٹ کا مشاہدہ:

❀ عظیم الشان منصوبے کی ضرورت کے مطابق تمام جدید سہولیات سے مزین پراجیکٹ آفس کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے۔ اور جلد ہی انجینئرز اس آفس میں تعمیراتی کاموں کی نگرانی کا آغاز کر دیں گے۔ آپ سائیٹ کے مشاہدہ کے لیے چکری انٹرچینج موٹر وے (M2) سے نکل کر اشارتی بورڈز کے مطابق پراجیکٹ آفس کا دورہ کر سکتے ہیں۔



پلاٹ بکنگ:

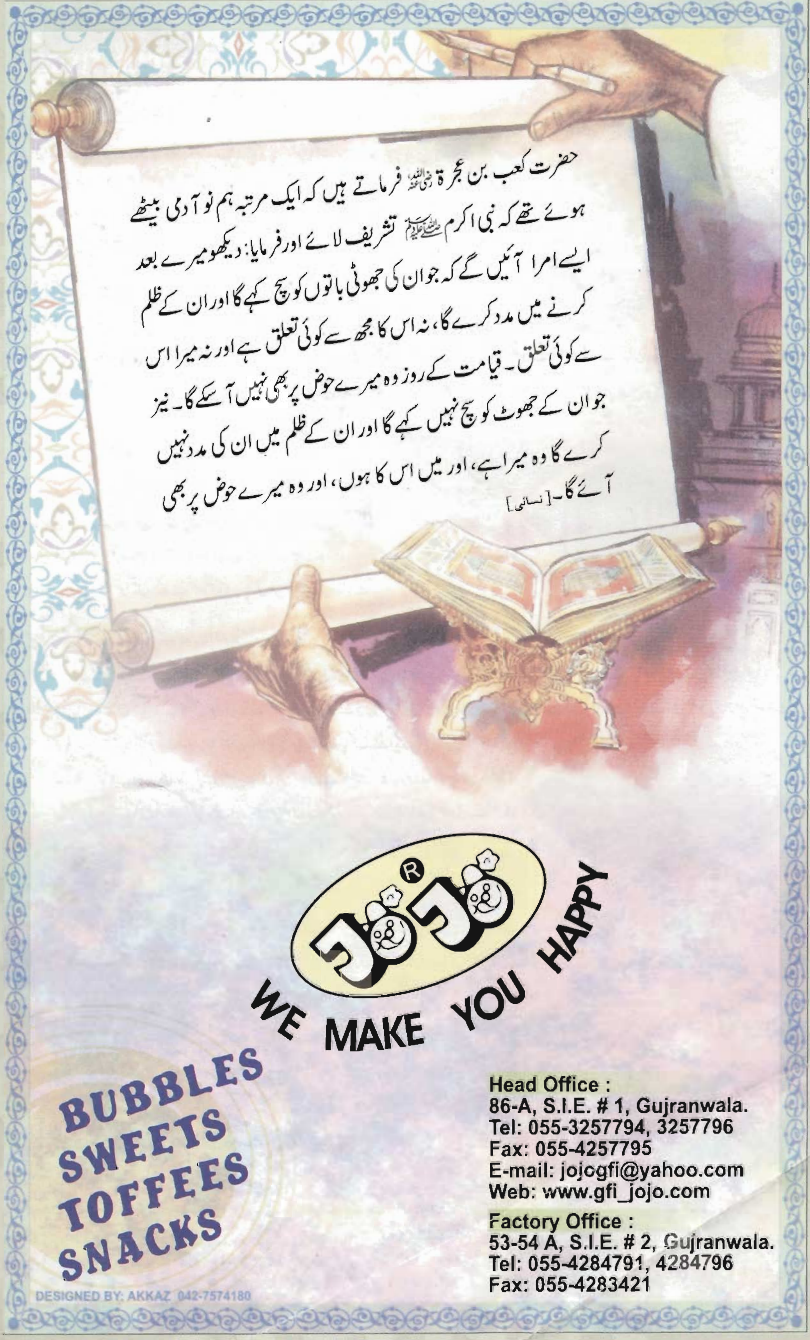
❀ ٹاؤن پلاننگ کی منظوری کے ساتھ ہی مزید پلاٹ بکنگ کے لئے پیش کر دیے جائیں گے۔
اور ساتھ ہی الاٹمنٹ کا طریقہ کار اور نئی قیمتوں کا تعین بھی کر دیا جائے گا۔

موجودہ پلاٹ ہولڈرز متوجہ ہوں:

❀ قرطبہ سٹی کے دفتر سے رابطہ کر کے اپنا ڈاک کا پتہ درست کروائیں تا کہ ڈاک کی ترسیل یقینی بنائی جا سکے۔ ایڈریس تبدیل کرنے کے لئے فارم دفتر سے حاصل کریں۔ اقساط پر بکنگ کروانے والے حضرات فوری طور پر اپنی بقایا اقساط جدول کے مطابق ادا کر دیں۔ بقایا جات جاننے کے لئے دفتر سے رابطہ قائم کریں۔
خواتین و حضرات اپنی رائے اور تجاویز سے مدینۃ العلم کے پتہ پر یا Email کے ذریعہ آگاہ کریں۔

مدینۃ العلم
فلیٹ نمبر 4، فسٹ فلور، خیبر پلازہ، فضل حق روڈ، بلیو ایریا، اسلام آباد
فون: 92-51-2206380 فیکس: 92-51-2270411
info@qurtabacity.com

Rev. 4.0



حضرت کعب بن عجرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم نو آدمی بیٹھے ہوئے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا: دیکھو میرے بعد ایسے امرا آئیں گے کہ جو ان کی جھوٹی باتوں کو سچ کہے گا اور ان کے ظلم کرنے میں مدد کرے گا، نہ اس کا مجھ سے کوئی تعلق ہے اور نہ میرا اس سے کوئی تعلق۔ قیامت کے روز وہ میرے حوض پر بھی نہیں آسکے گا۔ نیز جو ان کے جھوٹ کو سچ نہیں کہے گا اور ان کے ظلم میں ان کی مدد نہیں کرے گا وہ میرا ہے، اور میں اس کا ہوں، اور وہ میرے حوض پر بھی آئے گا۔ [نسائی]
JOJO®
WE MAKE YOU HAPPY
BUBBLES
SWEETS
TOFFEES
SNACKS
Head Office :
86-A, S.I.E. # 1, Gujranwala.
Tel: 055-3257794, 3257796
Fax: 055-4257795
E-mail: jojogfi@yahoo.com
Web: www.gfi_jojo.com
Factory Office :
53-54 A, S.I.E. # 2, Gujranwala.
Tel: 055-4284791, 4284796
Fax: 055-4283421
DESIGNED BY: AKKAZ 042-7574180